
پھول اور شعلے
قاضی نذرالاسلام

پھول اور شعلے

ناشر : چودھری عبدالحمید ایم۔اے
مطبع : مسعود پرنٹرز لاہور
قیمت : دو روپے پچاس پیسے

ابتدائیہ

اُس کے اشہب قلم نے شعلے اُگلے، چنگاریاں پھینکیں اور بغاوت کی آگ طول و عرضِ ملک میں پھیلا دی۔ وہ غیر ملکی استعمار کے خلاف مسلسل اور لگاتار جہاد کرتا رہا۔ اُسے قید و بند کی صعوبتیں جھیلنی پڑیں، اپنوں کے طعنے سننے پڑے، بیگانوں کا ہدفِ ملامت بننا پڑا، لیکن اُس کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی۔ وہ مخالفتوں کے طوفان کو خاطر میں نہ لایا۔ وہ ملامت کی آندھیوں سے ڈگمگایا نہیں۔ وہ ہمعصروں کی کڑی تنقید اور نکتہ چینی سے گھبرایا نہیں۔ اُس نے وہی کہا جو اُس کی آنکھوں نے دیکھا۔ دماغ نے محسوس کیا اور ضمیر کی حس نے اجازت دی۔ اُس نے جس ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں، وہ اُس سے بے حد متأثر

روندتا۔ خندقوں کو پھاندتا۔ دشمنوں کی کھوپریوں کو فٹ بال بناتا۔ برابر اپنی منزل کی طرف بڑھا چلا جاتا ہے۔ وہ نہ دریاؤں کی پروا کرتا ہے نہ فلک بوس پہاڑوں کو خاطر میں لاتا ہے۔ نہ لق و دق ریگزاروں سے خوف زدہ ہوتا ہے۔ نہ سرسبز و شاداب مرغزاروں کو دیکھ کر متاثر ہوتا ہے۔ اُس کے سامنے صرف ایک مقصدِ حیات ہے کہ فرسودہ نظامِ حیات کے کھنڈروں پر ایک ایسے نظامِ حیات کی داغ بیل ڈالے۔ کہ جس میں مذہب کے نام پر لوٹ کھسوٹ نہ ہو۔ جس میں انسان، انسان کے خون کو شرابِ ارغوان سمجھ کر شیرِ مادر کی طرح بغیر ڈکار لیے ہضم نہ کر سکے۔ جس میں چند سرمایہ دار دولت اور طاقت کے بل بوتے پر خلقِ خدا کو بھیڑ بکریوں کا گلہ تصور کر کے جدھر چاہیں ہانک کر نہ لے جا سکیں۔ جس میں ملوکیت کی بھٹی میں آگ روشن رکھنے کے لیے انسانوں کو ایندھن نہ بنایا جا سکے۔ چنانچہ نذرالاسلام جو بنگال کے ضلع بردوان کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں ایک کسان گھرانے میں پیدا ہوا تھا اور جس نے زندگی کی ابتداء پہلی جنگِ عظیم میں ایک سپاہی کی حیثیت سے کی تھی۔ جس نے جنگ کی ہولناکیوں میں خندوق میں بیٹھ کر موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنے جذبات کو پہلی نظم کی شکل دی۔ بنگال کا باغی شاعر بن کر بنگالی ادب کے آسمان

پر درخشاں بن کر چمکا۔

اس دہقان زادے کے گیت بنگال کے بچے بچے کی زبان پر جاری ہو گئے۔ کھیتوں میں ہل جوتنے والے کسان۔ کارخانوں میں کام کرنے والے مزدور۔ دفتروں کے کلرک۔ سکولوں اور کالجوں کے طلباء اور طالبات۔ اس کے گیتوں کو لے اڑے۔ سی آر داس ایسا محبِ وطن نذرالاسلام کی نظمیں اپنے اخبار کے صفحۂ اوّل پر شائع کر کے اس کی انقلابی شاعری کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو گیا۔ پروفیسر بنے کمار سرکار نے بنگلہ ادب پر اپنی ایک تصنیف میں نذرالاسلام کی نظم "باغی" کو بنگلہ ادب میں انقلاب کا محرک قرار دیکر بنگال کے ادب نواز حلقوں کو نذرالاسلام کے تتبع کی دعوت دی۔ اور اعتراف کیا کہ "بنگال کی سوئی ہوئی روح کو بیدار کرنے کا سہرا شاید مسلمانوں کے ہی سر بندھنے والا ہے۔" اس میں شک نہیں کہ ٹیگور سکول کے حامیوں نے نذرالاسلام کی شاعری پر شدید حملے کیے۔ لیکن ان حملوں نے نذرالاسلام کی شہرت کو داغدار کرنے کے بجائے اور چمکا دیا۔ اور بنگال کا نوجوان اور محبِ وطن طبقہ اُس کا شیدائی ہو گیا۔ ایک وقت آیا کہ ٹیگور آنجہانی کو نذرالاسلام کی بلند و ارفع حیثیت کا اعتراف کرنا پڑا۔

نذرالاسلام نے بنگلہ ادب میں عربی اور فارسی کی روح کو سمونے کی

پوری کوشش کی۔ اُس کی اس نئی طرز پر سخت لے دے کی گئی۔ اور اُسے فرقہ پرستی کا طعنہ بھی دیا گیا۔ لیکن وہ اپنے ڈگر سے ہٹا نہیں۔ چنانچہ آہستہ آہستہ اُس کی طرزِ نگارش کو مقبولیت حاصل ہوتی گئی۔ اور نوجوان طبقہ اُس کی کھلم کھلا تقلید اور تتبع کرنے لگا۔ آج وہ غزل بنگلہ ادب اور بنگلہ شاعری کا جزو لاینفک بن چکی ہے جس کا موجد نذرالاسلام ہے۔

نذرالاسلام نے بنگلہ شاعری میں نئی نئی بحریں ایجاد کیں اور ان بحروں کے اوزان موسیقی کے اصولوں پر وضع کیے۔ نذرالاسلام نے نہ صرف سنسکرتی بنگالی کے قالب میں عربی اور فارسی کی روح کو سمویا۔ بلکہ اُس نے بنگالی موسیقی میں بھی نئی طرزوں کو رواج دیا۔ ان نئی طرزوں کی اساس بھی بہت حد تک عربی اور فارسی موسیقی کے امتزاج پر رکھی۔ نذرالاسلام اپنی جدت پسند طبیعت۔ شاعری۔ اور موسیقی کی بدولت بہت جلد بنگال کا ہر دلعزیز شاعر بن گیا۔

ٹیگور سکول کی بڑھتی ہوئی مخالفت کے مقابلہ میں سی آر داس نے نذرالاسلام کو سنبھالا دیا۔ اور اس شاعرِ انقلاب کی نظموں کو اپنے انگریزی اخبار (FORWARD) کے سرورق پر شائع کرکے ان پر زوردار مقالات اور مضامین لکھے جن میں ٹیگور کے حامیوں کے اعتراضات کا جواب دیا۔ اور نذرالاسلام کو جدید بنگلہ ادب کا موجد قرار دیکر ٹیگور سکول کے طوفانِ مخالفت کو

بہت حد تک ختم کر دیا۔ ۱۹۲۶ء میں نذرالاسلام نے ایک ہندو دوشیزہ سے شادی کرلی۔ بس پھر کیا تھا۔ فرقہ پرست ہندوؤں نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ ایک طرف ہندو فرقہ پرست اُس کی جان کے لاگو ہو رہے تھے تو دوسری طرف مسلمان اُس کی بے باکی اور مذہب پر زبانِ طعن دراز کرنے کی وجہ سے اُس کے مخالف تھے۔ چنانچہ ہر طرف سے مخالفت کا طوفان اُمڈ آیا۔ نذرالاسلام کے لیے یہ بڑا نازک وقت تھا۔ سی آر داس سرگباش ہو چکے تھے۔ سارے ملک میں فرقہ وارانہ فسادات ہو رہے تھے۔ ایسے وقت میں نذرالاسلام کا ایک ہندو لڑکی سے شادی کر لینا ستم بالائے ستم تھا۔ بنگال بلکہ سارے ملک میں فرقہ پرست ہندوؤں نے طوفان برپا کر دیا۔ لیکن نذرالاسلام ایک چٹان تھا۔ جو اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔ طوفان اس سے سر ٹکرا ٹکرا کر بے نیلِ مرام لوٹ گئے۔ آندھیاں اٹھیں اور گزر گئیں۔ سیلاب آئے اور آگے کو نکل گئے۔ شعروادب کی یہ چٹان جسے نذرالاسلام کہتے ہیں اپنی جگہ پر قائم رہی۔ اس کی نظموں کے بہت سے مجموعے ضبط ہو گئے۔ اسے دوبار جیل کی ہوا کھانی پڑی۔ لیکن جبر و تشدد کے ان مؤرخوں کے سامنے سرنگوں نہیں ہوا۔ اُس نے جبر واستبداد کے دیوتاؤں سے رحم کی بھیک نہیں مانگی۔ اُس نے فرقہ پرست ہندوؤں اور قنوطی ملّاؤں کی مخالفت کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے بلکہ پوری بے باکی اور جرأتِ قلندرانہ سے کام

لیتے ہوئے وہی کیا جو اُس کی ضمیر کی بھٹی سے ڈھل کر نوکِ قلم کے ذریعہ قرطاس پر ثبت ہو گیا۔

نذرالاسلام کی شاعری کی ابتداء سرزمینِ نینوا پر ہوئی۔ وہ معرکۂ کربلا کے واقعات سے متاثر ہوا۔ پھر اس نے خلافتِ عثمانیہ کی تباہی سے اثر لیا کیونکہ یہ ایسا سانحۂ عظیم تھا کہ جس سے ساری دنیائے اسلام میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ نذرالاسلام بھی اس سے متاثر ہوا اور اُس نے انور، اور مصطفےٰ کمال پر دو رزمیہ نظمیں لکھیں۔ انہیں نظم نہیں بلکہ منظوم مکالمہ یا منظوم تمثیلچہ کہنا چاہیئے۔ لیکن اس کے بعد نذرالاسلام نے اپنے لیے ایک نئی راہ تجویز کی۔ اس راہ پر چل کر اُس کی شعری صلاحیتیں نکھر آئیں۔ اور وہ آتش نوا شاعر کی حیثیت سے بنگال کے ہر طبقہ میں پڑھا جانے لگا۔ یہ اس کی شاعری کا دَور ارتقائی دَور تھا۔ اس دَور کی نظموں میں جہاں وہ الفاظ کے پردہ میں انقلاب کی چنگاریاں پھینکتا ہے وہاں اُس کا تخیل اور فکر انتہائی بلندیوں پر پرواز کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اسی دَور میں اس نے ٹیگور کی قنوطی شاعری پر رہ رہ کر ضربیں لگائیں اور بنگلہ ادب کی بنیادِ کہنہ پر بنگالی شعر و ادب کی نئی عمارت تعمیر کی۔ ۱۹۲۶ء کے فرقہ وارانہ فسادات سے اس کی شاعری کا تیسرا دَور شروع ہوتا ہے۔ اس دَور میں حالات و واقعات سے مجبور ہو کر وہ غزل گوئی پر اتر آیا۔ لیکن وہ غزل میں بھی

قنوطیت، رجعت، فرقہ پرستی۔ سماج کی بے راہروی۔ نظامِ حکمرانی کے متعلق ایسے لطیف اور دل پذیر اشارے کر جاتا ہے اور ایسی طنز کرتا ہے کہ پڑھنے والا سر دھنتا ہے اور چٹخارے لیتا ہے۔ نذر الاسلام نئے رجحان کا علمبردار ہے۔ اس نے ٹیگور کی ابہام پسندی کو چھوڑ کر رومانی حقیقت پسندی کو اپنی شاعری کی اساس قرار دیا ہے۔

اگر ہم ٹیگور اور نذر الاسلام کی شاعری کا موازنہ کریں تو ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ٹیگور ایسے گیت گاتا ہے جن میں الفاظ کی رنگینی اور حسن تو ہے لیکن کوئی خاص فلسفہ حیات نہیں۔ وہ گیتوں میں موسیقی کو سمو کر وجدانی کیفیت پیدا کر سکتا ہے لیکن غلاموں کی رگوں کے منجمد خون کو اپنے گیتوں سے گرما کر انہیں ایک عظیم انسانی انقلاب کا علمبردار بنانے سے یکسر قاصر ہے۔ نذر الاسلام نے اُس جمود کو توڑ دیا۔ جسے ٹیگور کی شاعری نے پیدا کیا تھا۔ اور اپنے آتشیں نغموں سے انسانوں کے پُرسکون سمندر میں ایک ایسا جوار بھاٹا پیدا کر دیا کہ جس کی طوفانی موجوں کے سامنے ملوکیت کی سنگین عمارت لرزتی اور خم کھاتی نظر آتی۔

اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس برِصغیر میں دو عظیم شاعر پیدا ہوئے جو ایک نئے دَور اور انقلاب کے داعی تھے اور یہ دونوں ہی مسلمان تھے۔ اقبال اور نذر الاسلام آج کا مورخ گو اس حقیقت کو تسلیم

نہ کرے۔ لیکن آنے والی نسل ــ ان دو عظیم مسلمان انقلابی شاعروں کے فلسفہ حیات اور پیام انقلاب کا اعتراف کرے گی اور یہ ماننے پر مجبور ہو جائے گی کہ

اقبال کے فلسفہ خودی اور نذرالاسلام
کے باغیانہ گیتوں نے اس برصغیر کی غلامی
کی زنجیروں کو کاٹنے کے لیے ایسے نوجوانوں
کو جنم دیا جن کی قربانیوں نے غلامی کی
ظلمتوں کو شکست دے کر صبح آزادی کے
طلوع کے لیے راستہ صاف کر دیا۔

۱

زمین کی وسعتوں ۔
اور آسمان کی رفعتوں میں
صبح و شام تیرے ہی نام کا ورد کیا جاتا ہے ۔
انسان ہو یا حیوان ۔
طائرانِ بلند پرواز ہوں یا حشرات الارض
خس پوش جھونپڑیوں میں سسک سسک اور بلک بلک کر زندگی بسر
کرنے والے مزدور ہوں
یا ــــــــ
مرمریں محلوں کی عطر بیز فضا میں طرب و نشاط اور سرود و نغمہ طراز ماحول
میں مگن رہنے والے شہنشاہ اور سرمایہ دار ۔

سب تیرے نام کی ہی مالا جپتے ہیں اور ورد کرتے ہیں۔

کون نہیں جانتا۔ اور۔ کِسے نہیں معلوم۔ کہ

تو ابدی اور غیر فانی ہے۔

تو لایزال ہے۔

تو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔

یہ دنیائے ہست و بود۔

یہ کائنات غیر محدود

تیرے ہی اشارۂ کُن سے عالمِ شہود و وجود میں آئی۔

میں حیران و ششدر ہوں۔ اے صنّاعِ قدرت!

جب یہ تمام کائنات تیرے ہی ایک ادنیٰ اشارۂ ابرو سے ظہور پذیر ہوئی ہے

اور۔ جب یہ ساری مخلوق تیری ہی صناعی اور کاریگری کا نادر نمونہ ہے

تو پھر یہ تفاوتِ من و تو کیوں ہے۔

مجھے حیرت ہے اے مصوّرِ عالم۔

کہ۔ تیری قدرت کے کارخانہ میں تفریق کی ایک ایسی لہر اُٹھ رہی ہے۔ اور ایسا

جوار بھاٹا پیدا ہو رہا ہے۔ جس نے انسان کو انسان سے جدا کر دیا ہے۔

تو نے انسانی تماشا گاہ میں مساوات کا ایک اصول قائم کیا تھا۔

اور اس اصولِ مساوات کو واضح اور روشن کرنے کے لیے تو نے جب انسان

کو اس رزمگہ میں بھیجا۔ تو وہ سب ننگے تھے۔ وہ رو رہے تھے۔ لیکن اُن کے گرد جو لوگ جمع تھے۔ وہ مسکرا رہے تھے۔ اور قہقہہ زن تھے۔ اور جب تُمنے انھیں اپنی طرف بلایا۔ تو وہ خاموش تھے۔ اور لوگ نوحہ کناں اور اشک افشاں تھے۔

یہ تیری مساوات کا ایک غیر فانی اور ان مِٹ اصول تھا۔

لیکن ۔

یہ انسان ۔ جس کے قدموں پر سجدہ کرنے کا فرشتوں کو حکم دیا گیا۔

اور جس سے سرتابی کرنے پر معلم ملکوت کو راندہ درگاہ بنا دیا گیا۔

وہ انسان ۔ اتنا مغرور اور سرکش ہو گیا۔ کہ اُس نے تیرے بنائے ہوئے تمام اصولوں کو توڑ دیا ۔ تیرے نظامِ قدرت کو چیلنج کرنے لگا۔

بلکہ ایک قدم اور آگے بڑھا۔ اور خدائی کا دعویدار بن گیا۔

اور ۔

پھر اُس نے اپنی طاقت و قوت ۔ کو وحشت و بربریت کا رنگ دے کر تیری مخلوق کو مجبور کیا۔

کہ ۔

اُس کے آستانۂ جلال پر سجدہ ریز ہوں۔

اس کی ملوکیت و جبروت کی پرستش اور پوجا کریں۔

اور اُس کو خدا تسلیم کرکے ۔ اُس سے اپنی مرادیں مانگیں۔

تو دیکھتا رہا۔ اے آسمانوں اور زمینوں کے مالک۔

اے خدائے لایزال۔

کہ ۔۔۔

سرمایہ کی چوکھٹ پر مزدور کا خون بہتا رہا۔

تو دیکھتا رہا۔

کہ ۔۔۔

بلند اور رفیع الشان محلوں میں رہنے والے مصنوعی خداؤں نے ۔جھونپڑیوں

میں رہنے والوں کو ظلم کے پاؤں کے نیچے روند دیا۔

وہ سسکتے رہے۔

اُن کے دردناک نالے ۔۔۔ اور جگر زدہ آہیں ۔ آسمان کی سقف نیلی سے

ٹکراتی رہیں۔

لیکن ۔۔۔ اے خدا۔ ظالم کا ظلم بڑھتا گیا۔ تو حرکت میں نہ آیا۔

غریبوں کی جھونپڑیاں پامال ہوتی رہیں ۔

اُن کی عزتوں کو ان کی نظروں کے سامنے لوٹ لیا گیا۔

ان کے بچوں کو بھوکا ۔ اور ۔ پیاسا ۔ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر اور سسک سسک

کر مرنے کے لئے چھوڑ دیا گیا۔

ان سے وہ تمام وسائل و ذرائع ترقی چھین لئے گئے ۔ جو انسان ہونے کی وجہ

سے تو نے انہیں تفویض کر رکھے ۔
لیکن تو خاموش رہا ۔
یہ تماشا ۔۔۔ یہ ہنگامۂ قتل و خون ۔۔۔ یہ انسانی آزادی ۔۔۔ اور مردم کشی ابتدائے آفرینش سے ہے کہ اب تک جاری ہے اور تو ہی جانے کہ کب تک جاری رہے ۔
انسانوں کے ظلم نے انسانوں کو تیری ذات سے جو پاک اور ارفع ہے ۔ بغاوت پر آمادہ کر دیا ۔۔۔ ان کے دل و دماغ بغاوت کے جذبات سے سرشار ہو رہے ہیں ۔
اور وہ مشتعل ہو کر ۔۔۔ نہ صرف تیری خدائی کے منکر ہوتے جا رہے ہیں ۔ بلکہ نظام مروجہ کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کے درپے ہیں ۔
اے خدائے لایزال ۔
مجھے اپنے عجز کا اعتراف ہے ۔
لیکن میرا عجز ۔۔۔ اب شعلوں کی شکل اختیار کر کے ایک غیر منضبط آتش بغاوت بن گیا ہے ۔
اس میں میرا قصور نہیں ۔
اس میں میری خطا نہیں ۔
میں تو تیرا عاجز بندہ تھا ۔
لیکن دنیا میں غیر مساوی تقسیم نے مجھے ۔

ایک باغی اور سرکش انسان بننے پر مجبور کر دیا۔
میں اب بھی ترے آستانۂ جلال پر سر جھکاتا ہوں۔
لیکن میرے ان سجدوں میں سرکشی اور خود آرائی نمایاں ہے۔
تو جانتا ہے۔
میری اس سرکشی اور بغاوت کا محرک کون ہے؟

۲

میرے بپھرے ہوئے شباب — کے جلو — میں آندھیاں۔ طوفان۔ بغاوتیں۔ اور جنگیں رقص کناں ہے۔

میری اُٹھتی جوانی — ایک ایسے انقلاب کی پیامبر ہے۔
جو ماضی کی حسین یاد کو محو کر دے گی۔ اور تاریخ کے اوراق کو خوں کی روشنائی سے مزین کرے گی۔

اور — یہ دقیانوسی کتابوں کے پشتارے — میری جوانی — کے آتشیں سانسوں کی زیروبم میں جلتے نظر آئیں گے — ہاں یہ دقیانوسی کتابیں جو غلامی کا درس دیتی ہیں۔ اور جن کی اساس محمود و ایاز کے فلسفہ پر رکھی گئی ہے — ایک فرسودہ فلسفہ پر۔ جن کا نظریہ آقا و غلام کی غیر انسانی تعلیم پر استوار کیا گیا ہے۔

اور یہ عبادت گاہیں — یہ مندر — جن میں گناہ کو جنم دیا جاتا ہے۔ اور انسان۔ کو — انسان — کے سامنے جھکنے کی تبلیغ کی جاتی ہے جن میں بزدل بوڑھے —

اپنے ناقابلِ معافی گناہوں کو چھپا کر اپنی پاکیزگی — اور — سرفرازیت — کی دف — رات — دن بجاتے رہتے ہیں — میری جوانی کے طغیان افزا دھاروں کے سامنے زمیں بوس ہو جائیں گے —

میری جوانی —

شمشیر بکف ایک نامعلوم منزل کی طرف جادہ پیما ہے —

رسم و رواج کی چٹانوں — اور قدامت پسندی کے گھروندوں کو پاؤں تلے مسلتی ہوئی — ایک نئے نظام — اور ضابطۂ حیات — کا انقلاب آفریں گیت گاتی ہوئی — ایک نامعلوم منزل کی طرف بڑھے چلی جارہی ہے —

جوانی —

ایک جرأت رندانہ کے ساتھ —

ایک جذبۂ پرخلوص کے ساتھ —

مذہب کے پردوں کو چاک کرتی ہوئی

ظلم و تشدد کی سرحدوں کو پھاندتی اور نابود کرتی ہوئی —

قسمت کے چکر سے انسانوں کو نکالتی —

اور حقیقت سے روشناسی کرتی —

ایک باغی — اور سرکش جوانی —

انجام سے بے خوف — اور حالات سے بے نیاز —

ایک طوفانی ندی کی طرح — بڑھ رہی ہے۔
اس کے راستے میں نہ رسم و رواج کی چٹانیں ٹھہر سکیں گی۔ نہ قدامت پسندی کے گھروندے — نہ خود فریب پیروں کے قمقموں سے جگمگاتے ہوئے محل اور نہ شخصی اقتدار کی سنگین دیواریں — نہ سرمایہ دار کا عنکبوتی جال — اور نہ فرسودہ نظام حکومت۔

جوانی۔
تخیل نو۔ کی محرک ہے۔

جوانی۔
ایک نئی دنیا کی خالق۔
ایک ایسی دنیا کی۔
جس میں نغمے ہی نغمے ہیں۔ قہقہے اور پھول ہیں۔ مسرت و شادمانی کی پریاں ناچتی ہیں۔ اور انبساط و نشاط کی حوریں گیت گاتی ہیں۔ چوگان ہستی میں جوانی —— اُس شہسوار کی طرح ہے۔ جو بلند و پست — اور نشیب و فراز کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اپنے اشہب تازی کو سرپٹ دوڑائے چلے جاتا ہے۔ نہ ندیاں اُس کے راستے میں حائل ہوتی ہیں نہ دریا۔ نہ جنگل اور صحرا اور نہ فلک پیما پہاڑ نہ بحر ناپیداکنار۔

جوانی۔
ایک عظیم انقلاب کی علمبردار ہے۔

وہ تاریک رات میں ـــ طوفانی ندی میں ـــ ناؤ کو ڈال کر صبح تک ساحل پر پہنچنے کے لئے اپنے مضبوط بازوؤں سے پتوار چلاتی ہے۔ موجوں کے تھپیڑے۔ اور لہروں کے ہچکولے اس کے عزم مسلسل۔ کو شل نہیں کر سکتے۔ بالآخر۔ اس کی ہمت واستقلال کے سامنے۔ ندیاں اور دریا پایاب ہو جاتے ہیں۔ اور وہ اُن کی سطح کی ملکہ بن کر اپنا حکم چلاتی ہے۔

جوانی۔

جس کے کوہ شکن بازو کی ضربت سے موت کے قلعے ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں۔ جو طوفانوں سے کھیلتی ہے۔ اور موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکراتی ہے جو سمندر کی اتھاہ گہرائی اور فلک پیما پہاڑ کی چوٹی پر اپنی عظمت و جلالت کے پھریرے گاڑ کر جلال انسانی کے طرہ میں عزم واستقلال کے سدابہار پھول ٹانک دیتی ہے۔

جوانی۔

جس نے بادلوں پر کمندیں ڈال رکھی ہیں۔ اور زمینوں کی طنابیں کھینچ رکھی ہیں جو برق و باد کے طوفانوں کے منہ موڑ دیتی ہے۔ جو کارخ کسرٰے اور طنطنۂ قیصری کا منہ چڑانے سے بھی نہیں ہچکچاتی میں اُسی جوانی کے گیت گاتا ہوں۔

جوانی۔ دیوانے کا خواب اور فرزانے کا فلسفہ نہیں۔ بلکہ کیف سرمدی ہے اور سرودِ بغیر محیط۔ جو نسل و رنگ۔ اور غربت و سرمایہ کی قیود کو توڑ کر ہر ایک کو اپنے

آغوش میں لے لیتی ہے۔

جوانی۔

جو کبھی منصور بن کر دامن و دار سے کھیلتی ہے۔ اور کبھی ضرارؓ کے نیزے کی اَنی بن کر قیصرِ روم کے تاج کو زمین پر گرا دیتی ہے۔

جوانی۔

ایک ایسا گیت۔ جس کی لے میٹھی اور وجد آفریں۔ اور جس کے الفاظ جوش و انقلاب کے خمیر سے وضع اور تخلیق کئے جاتے ہیں۔

جس کے خون کی سُرخی۔ مطلعِ فلک بن کر جگمگا اٹھتی ہے۔

اور جس کے نعرے۔

نغمۂ سحر بن کر۔

صورِ بیداری کے پیامبر بن جاتے ہیں۔

میں اسی خود دار۔ جوانی کے گیت گاتا ہوں۔

ایسی جوانی۔ پر۔ کروڑ بڑھاپے قربان۔

○

۳

بادلوں کی گرج کڑک۔ دریا کے پیچ و تاب۔ اور موجوں کے گرداب سے نہ ڈر۔

اے ناخدا۔

بادبان اٹھا۔ اور کشتی کو موجوں کے حوالے کر کے طوفان کا گیت گا۔

تو ڈرتا ہے۔

موجوں کے تھپیڑوں۔ اور لہروں کے ہچکولوں سے۔

گردابوں اور بھنوروں سے

جوار بھاٹے۔ اور طوفان سے۔

اے ناخدا۔

کیا تو بھول گیا۔

تیرے آباؤ اجداد نے۔

طوفانوں میں آنکھیں کھولیں۔

طوفانی موجوں اور صبر شکن لہروں کا جھولا جھولا۔

اور دریا کی طغیانی سے ناطہ جوڑ کر زندگی گزار دی۔

وہ ۔۔ دیکھ ۔۔ دریا کے اُس کنارے خس پوش جھونپڑی میں مٹی کا چراغ ٹمٹما رہا ہے ۔۔ اور ملاح کا خشک حقہ۔ کسی آنے والے کا انتظار کر رہا ہے۔

کتنے طوفان آئے ۔ کتنے سیلاب آئے۔ لیکن یہ جھونپڑی ۔۔ اُس مقام پر ایستادہ ہے جہاں اسے تیرے آباؤ اجداد نے بنایا تھا۔

اِسی جھونپڑی میں تیرے دادا نے جنم لیا۔ اِسی میں تیرا باپ پیدا ہوا۔ اِسی کی تاریکی میں تو نے آنکھیں کھولیں۔ دریا میں طوفان تھا۔ بادل گرج رہا تھا۔ موجیں بپھر رہی تھیں۔ اور لہریں ۔ اس جھونپڑے کے قدم چوم رہی تھیں۔ ایسے میں تو اس دنیا میں آیا۔ جھونپڑی کا چراغ اُس وقت بھی اِسی طرح ٹمٹما رہا تھا۔ اور حقہ اُس وقت بھی خشک تھا اور آج بھی۔

تیرے باپ اور دادا نے اپنی بوڑھی کشتی دریا میں ڈال دی۔

اور تری پیدائش پر مچھیروں نے مل کر دریا کا گیت گایا۔

کتنا جوش آفریں تھا۔ وہ گیت۔

سنو۔ اے ناخدا۔ وہ گیت۔

ہم سمندر کی اولاد ہیں۔

ہم اس کے سینے پر لیٹتے ہیں۔ اور اس کی موجوں سے کھیلتے ہیں۔

ہم طوفانوں اور سیلابوں میں مسکراتے ہیں۔

اور گردابوں میں ناچتے ہیں۔

ہم موجوں کے منہ موڑ دیتے ہیں۔

اور برستے بادلوں کو دیکھ کر قہقہے لگاتے ہیں۔

ہم سمندر کی اولاد ہیں۔

اور ۔ جو ۔ طوفانوں سے ڈرتے ہیں۔ اور بپھری ہوئی موجوں سے

ہراساں ہیں۔

وہ ہم میں سے نہیں۔

ہم دریا کے سینہ پر اپنی عظمت کا پرچم لہراتے ہیں۔

اور تاریک راتوں ۔۔۔ اور مہیب برساتوں میں۔

اپنی کشتی کو کھیتے کبھی ہچکچاتے نہیں۔

اور یہی ہماری اولاد کا طغرائے امتیاز ہے۔

اور اپنی غرقابی پر کبھی آبدیدہ نہیں ہوتے۔

ہم سمندر کی اولاد ہیں ''

اے ناخدا،

سُنا، تو نے وہ گیت۔

جو تیرے باپ دادا نے اپنے دوسرے ساتھیوں سے مل کر دریا کی سطح پر گایا۔

گیا تو اسے برداشت کرے گا۔

کہ تیرے اباو اجداد کی روشن اور درخشندہ پیشانیوں پر تیری بزدلی کا سیہ داغ لگ جائے۔

اور تیری نامردمی کی وجہ سے اُن کی شناوری کا نام بدنام ہو جائے۔

طوفان سے نہ ڈر۔

بپھری ہوئی موجوں سے ہراساں نہ ہو۔

بادبان کھول دے۔ اور کشتی موجوں کے حوالے کر کے خوشی کے گیت گا۔

O

۴

یہ ریت نہیں ۔ بلکہ سراب ہے ۔

جس کے نیچے دکھ درد کی دلدل چھپی ہوئی ہے ۔

بجلی کی چشمک اشارہ کر رہی ہے کہ اسے محرومِ نشاط اپنی بساط لپیٹ لے ۔

بادلوں نے اپنے سوتے کھول دیئے ہیں ۔ اور پانی اس طرح برس رہا ہے جس طرح حرماں نصیب ماں کی آنکھوں سے آنسوؤں کا طوفان امڈا چلا آ رہا ہو ۔ اور تیز و تند ہوا درختوں کو اس طرح ہلا رہی ہے جیسے کوئی دوشیزہ جوانی کے نشہ میں بدمست ہو کر اپنے دونوں بازو پھیلا دیتی ہے ۔

اور تیری کشتیاں ۔ سیلاب کی طغیان افزا موجوں میں ہچکولے کھا رہی ہیں ۔

دُور کنارے پر ۔ ندی کی گود اُن سے سُونی ہے ۔

اے ناخدا ۔

بادباں کھول دے ۔ کنارے پر بندھی ہوئی کشتی ۔ موجوں کے تھپیڑے کھا کر

چراغِ سحری کی لَو کی طرح تھرا رہی ہے۔

چھوڑ دے۔ کشتی کو۔ طوفان۔ کی موجوں میں کھول دے۔ لنگر اٹھا دے۔

سیلاب کناروں کو پھاند کر۔ تیری جھونپڑی میں داخل ہو رہا ہے۔

اور عمرِ رواں۔ ساحل کے حسین نظاروں کو واپسیں نظروں سے دیکھ رہی ہے۔

یہ حسین نظارے۔ یہ اندھیری رات۔ اور دریا۔ تیرے ہمدمِ دیرینہ ہیں۔

لیکن۔ اب تو ایک پھٹی ہوئی چٹائی پر پڑا ہے۔

ایک طویل۔ اور پر مصائب سفر کے بعد۔

ایک ایسے سفر کے بعد۔

جس میں کرب و اندوہ کی وادیاں تھیں۔ غم و آلام کی چٹانیں۔ اور جانگسل فاقوں

کی گھاٹیاں۔

تو اپنے فقر میں مگن رہا۔

تو اپنی غربت پر شاکر رہا۔

تجھے نہ کبھی زر و جواہر کی طلب ہوئی۔

اور نہ چاندی اور سونے کی خواہش۔

تو نے اپنے جام سفال۔ ٹوٹے ہوئے مٹی کے چراغ۔ پھٹی ہوئی چٹائی۔

اور چھوٹی سی خس پوش جھونپڑی پہ قناعت کی۔

اسی جھونپڑی پہ۔

جس نے تمہیں کڑکڑاتے جاڑوں۔ جھلسا دینے والی دھوپوں میں ۔۔۔ اور طوفان افزا برساتوں میں پناہ دی۔

تو نے اسے ہی مقصد حیات سمجھا۔

اور۔

تیری اس متاع عزیز۔ کو بھی بیماری۔ پیری۔ اور موت نے تیرے جھونپڑے میں داخل ہو کر چھین لیا۔

جاگ۔ اے گہری نیند کے ماتے ناخدا۔

تری کشتی میں سوراخ ہو چکا ہے۔

اور۔ وہ دریا کی تہہ میں پہنچتی جا رہی ہے۔

دیکھ۔ تھپیڑوں نے۔ کشتی کو تختہ تختہ کر دیا ہے۔

اور یہ تختے۔ سطح آب پہ بکھر گئے ہیں۔

اور سیلاب نے تیری چٹائی کو گھیر کر۔ تیرے جسم کو اپنی آغوش میں لے لیا ہے۔

جاگ۔

موت۔

تجھ سے بغل گیر ہو رہی ہے۔

اب تجھے کس کا خطرہ ہے۔

آنکھیں کھول دے۔

اب نہ طوفان تجھے خوف زدہ کر سکیں گے۔
نہ کشتی کے ڈوبنے کا فکر ترے دامن گیر ہو گا۔
اب تو۔ اس منزل کی طرف جادہ پیما ہے۔
جہاں مکمل مساوات ہے۔
جہاں رنگ و نسل کا امتیاز نہیں۔
جہاں امیر و غریب کا فرق نہیں۔
جہاں۔ سب۔ یکساں ہیں۔
جاگ اے نیند کے ماتے ناخدا۔
طوفان گزر گیا۔
ہوا تھم گئی۔
موجیں رک گئیں۔
اور دریا میں سکون آگیا۔
ملاحوں کی بیٹیاں۔ دف بجا کر۔ امن کا گیت گانے لگیں۔
تو بھی جاگ۔
اے مانجھی۔ جاگ۔

○

۵

ان ویرانوں اور پہاڑوں کے تاریک غاروں میں آنکھیں بند کیے۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر کس کی تلاش کر رہے ہو۔

تم ان ویرانوں۔ پہاڑوں اور جنگلوں میں جس خدا کو ڈھونڈ رہے ہو۔

وہ خالق حقیقی۔ تو شہ رگ سے بھی قریب ہے۔

یہ ساری کائنات۔ یہ جنگل۔ اور پہاڑ۔ یہ دریا اور ندیاں۔ یہ آسمان اور زمین۔ یہ باغات۔ اور رنگا رنگ پھول۔ یہ ستارے اور مہ پارے سب اُسی کے نشاں ہیں۔

وہی نور ہیں۔ اور وہی نار ہیں۔

خدا کی تلاش۔ دل کے آئینہ میں کرو۔

کیا تم ہی خدا کے اجارہ دار ہو۔

یہ فریب کے پردے۔ جو تم نے ڈال رکھے ہیں۔

یہ قشقہ و محراب۔
جو تمہاری پیشانی کی زینت ہیں
تمہاری پاکیزگی کے بجائے تمہاری معصیت کو نمایاں کر رہے ہیں۔
ترکِ دنیا ــــ گناہ ہے۔
اور رہبانیت ــــ بزدلی۔
کشمکش حیات میں گم ہو کر اُس کی تلاش کرو۔
کیا تم نہیں جانتے۔
کہ جوہری ساحل پر بیٹھ کر موتیوں کا سودا کرتے ہیں۔
اور نہیں جانتے۔
کہ سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں۔
آبدار موتیوں کی کتنی تہیں جمی ہوئی ہیں۔

کاش۔
وہ سمندر کی گہرائی سے بھی واقف ہوتے۔
اور
اس کی تہہ میں چھپے ہوئے اور بکھرے ہوئے موتیوں کی حقیقت سے
شناسا ہوتے۔
اے ندیم۔!

کتابوں کی ہیرا پھیری سے نکل کر۔
من کی دنیا میں ڈوب کر
اُس کی حقیقتوں کا تماشا کر۔

O

۶

اس وسیع کائنات میں۔
نیلگوں آسمان کی غیر محدود چھت کے نیچے۔
جس قدر انساں ہیں۔
سب ایک ہی رشتہ سے تعلق رکھتے ہیں۔
اور ایک ہی خالق کی مخلوق ہیں۔
نسل ورنگ کے جھگڑے۔
اور جغرافیائی حدود کی قیود۔
سب مصنوعی اور خود ساختہ ہیں۔
ورنہ انسانوں میں انساں ہونے کی صورت میں کوئی فرق نہیں۔

پجاری۔
دیکھ۔ تیرے دروازے پر بھوک کا دیوتا۔ کھڑا دستک دے رہا ہے۔ اٹھو۔

اے پجاری۔ پوجا کا وقت ہو گیا۔

گہری نیند کا ماتا۔ پجاری۔ مندر کے دروازے پر دستک کی آواز سن کر آنکھیں ملتا ہوا بیدار ہوا۔ اور اس نے مندر کے کواڑ کھول دیئے۔ اس وقت وہ سوچ رہا تھا۔ کہ دیوتا کی ایک نظر التفات۔ میری تاریک زندگی کو درخشندہ و تابندہ بنا دے گی۔

دروازہ کھلا۔ تو اس کی نیم وا آنکھیں۔

ایک نحیف و لاغر مسافر سے دوچار تھیں۔ پچکے ہوئے گال۔ ابھرے ہوئے جبڑے پیشانی میں دھنسی ہوئی آنکھیں۔ پھٹے ہوئے تار تار کپڑے۔ وہ بید مجنوں کی طرح کانپ رہا تھا۔ ہڈیوں کا مجموعہ۔

اُس نے کانپتی اور لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

بابا۔

بھوکا ہوں۔

کئی دن سے بھوکا۔

پجاری۔ نے غصہ سے جھنجھلا کر دروازہ بند کر لیا۔

روٹی۔ بھوک۔ یہ مندر ہے۔ مندر۔

نادان انسان۔

بھکاری۔ تاریک رات میں۔ سردی سے کانپتا اور لرزتا ہوا۔ بھوک اور

سردی کی تاب نہ لاکر وہیں گر پڑا۔ اُس نے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا۔

اے بھگوان ۔۔ یہ تیرا مندر نہیں۔

بلکہ پجاری کا گھر ہے۔

اور مندر کے اندر ۔۔۔ پجاری نے ڈٹ کر کھیر ۔ اور پوریاں کھائیں۔ لیکن ایک بھگوان کا بندہ ۔ مندر کے بند دروازے پر بھوک اور سردی سے ایڑیاں رگڑ رگڑ اور سسک سسک کر مر گیا۔

میں نے ایک رفیع الشان مسجد ۔منقوش دروازے پر ایک فاقہ کش بھکاری کو صدا کرتے سنا۔

بابا ۔ بھوکا ہوں۔

کچھ دو ۔ خدا کے نام پر۔

ایک نوجوان ۔ خوبصورت رکابیوں میں پلاؤ ۔ اور قورمہ ڈالے ۔ مسجد میں آیا۔ اور بھکاری کے قریب سے گزر کر ۔ حریص ملّا کے قریب پہنچ گیا۔ جو رکابیوں کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

فقیر نے پھر کہا۔

رقت انگیز ۔۔ اور درد انگیز آواز میں کہا۔

بابا بھوکا ہوں ۔

کچھ دو۔ خدا کے نام پہ۔

مسجد کے اجارہ دار۔ ملا۔ نے دیدے پھاڑ کر کہا۔

مردود۔ کہیں کا۔

یہ بھوک تیرے گناہوں کی سزا ہے۔

تو نے کبھی بھولے سے بھی نماز نہیں پڑھی۔

بھکاری نے کانپتی اور لرزتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"جی نہیں"

مغرور ملا نے چیخ کر کہا۔

کم بخت کہیں کا۔ نکل۔ خدا کے گھر سے۔ اور اُس نے مسجد کے کواڑ بند کر کے قفل چڑھا دیا۔

فقیر نے کہا۔

اے خدائے لایزال۔ میں نے اسی سال کی عمر میں تجھے کبھی بھولے سے بھی یاد نہیں کیا۔ لیکن تو نے اِس طویل مدت میں کبھی ایک روز کے لئے بھی میری روٹی پر پابندی نہیں لگائی۔ لیکن یہ ملا۔ اور پنڈت۔ جو تیرے گھر پہ قابض ہیں سفرعون بے سامان بنے بیٹھے ہیں۔

تیری خدائی کے اجارہ دار۔

فقیر مشتعل ہو گیا۔

اُس نے آسمان کی طرف آنکھیں اُٹھا کر کہا۔

کہاں ۔ ہیں؟

ہلاکو ۔ چنگیز ۔ غزنوی ۔ اور کالا پہاڑ ۔ ؟

ان مقفل عبادت گاہوں کو بیخ و بن سے اُکھاڑ پھینکیں۔

یہ ظالم ۔ پجاری ۔ یہ مغرور ملّا ۔

گناہ کی اولاد ۔ خدا کے باغی۔

اللہ کے گھروں پر قفل ڈالنے والے۔

لاڈ ۔ بھتو رٹا ۔ اور کمال۔

توڑ دو قفل ۔ اکھاڑ دو ۔ ان سیہ خانوں کو۔

یہ عبادت گاہیں۔

منافقت، اور ریا کاری کے مرکز بن چکے ہیں۔

نفس پرستی کے اڈے۔

دین فروشی کے ادارے۔

دشمنی اور نفرت کا پرچار کرنے والی درسگاہیں۔

خدا کے نام پہ خدا فروشی کرنے والے۔

دین کے نام پر دین کی بنیادیں اکھاڑنے۔

قرآن ــــ وید اور انجیل ــــ رٹ کر۔ ان کی روح سے مذاق کرنے والے ملاّ

پادری۔ اور پنڈت۔ دجل و فریب کے متحرک پیکر۔

انسانیت اور اخلاق سے عاری۔ ہمدردی اور محبت سے تہی۔ نفرت کے پتلے۔

کیا۔ اس قابل ہیں۔

ان عبادت گاہوں پر قابض رہیں۔

مذہب کے نام پر لوگوں کو لوٹیں۔ اور عزتوں کا صفایا کریں۔

فقیر نے۔ غصہ میں کانپتے ہوئے کہا۔

او۔ دین فروش ملاؤ!

او۔ "پوترتا" کے نام پر غلاظت پھیلانے والے پنڈتو!

ہم خاک نشینوں کو نفرت سے نہ دیکھو۔

ہمارا تمسخر اور مذاق نہ اڑاؤ۔

کیا "انا" کی عظمت کا اندازہ تم کر سکتے ہو۔

ممکن ہے۔ ان ہی پھٹے پرانے گوڈری پوش خاک نشین انسانوں میں وہ

بلند مرتبت انسان ہوں۔ جن کی چوکھٹ پر فرشتوں کو سجدہ کا حکم دیا گیا ہو۔

ان میں ہی شہسواران طریقت و حقیقت چھپے ہوں۔

او نادانو۔

انھیں نفرت و حقارت سے نہ دیکھو۔

ان کے سینہ میں بھی دل ہے۔ اور دل میں خدا کا نور۔
کیا تم ان سے اس لئے نفرت کرتے ہو۔
کہ ۔۔۔ یہ۔
بیمار۔ نحیف۔ مفلس اور نادار ہیں۔
دنیا کے یہ عبادت خانے ۔ ابن آدم۔ سے زیادہ مقدس و اطہر نہیں ہو سکتے۔
تم کیا جانو۔
اس بھیکارن کے بطن سے ایک ایسا انسان جنم لے۔ جو تاریخ عالم کی ہیئت کو ہی بدل دے۔ اور ایک ایسی دنیا تخلیق کرے۔ جس میں انسانیت کی اساس محبت پر رکھی جائے۔
تم ان جھونپڑیوں کو نفرت سے نہ دیکھو۔
تم کیا جانو۔ کہ
ان جھونپڑیوں میں۔ کوئی ایسا جو ہر نایاب پل رہا ہو۔ جس کی ندا سننے کیلئے زمانہ ایک مدت سے گوش بر آواز ہے۔
انھیں زمین کا بوجھ سمجھ کر حقارت کی ٹھوکریں نہ مارو۔
تم کیا جانو۔
ان میں کتنے بایزید۔ اور ہریش چندر ہوں۔ کل جب ان ہی خاک نشینوں میں سے کسی نے سر اٹھایا۔ اور جاہ و حشم نے اس کے قدم چومے۔ تو تم ہی ہو گے۔

جو اُن کے آستان جلال پر سجدہ ریز نظر آؤ گے۔ ان کی قصیدہ خوانی کرو گے۔

انھیں گوالا اور چرواہا کہہ کر نفرت کی ہنسی نہ ہنسو۔

کسان۔ کے گاڑھے کے میلے کچیلے کپڑوں۔ اور پھٹی ہوئی پاپوش پر نفرت و حقارت کے ڈونگرے نہ برساؤ۔ ہو سکتا ہے۔ کہ ان میں سے کوئی مستقبل کا تاجدار ہو!

ان چرواہوں کو حقارت سے نہ دیکھو۔ تم نہیں جانتے۔ ان میں سے ہی ایک ایسا نبیؐ پیدا ہوا۔ جس کی رحمۃ العالمینی۔ کے صدقے میں۔ انسانوں کا درجہ انتہائی بلند ہو گیا۔

تمہارے دروازے پر کوئی فاقہ کش آیا تھا۔ تم نے نفرت و حقارت سے انھیں دھکے دے کر بھگا دیا۔ نادانو۔ تمہیں کیا معلوم۔ کہ اس بھیس میں کوئی مردِ حق آگاہ ہی ہے۔ تمہاری آزمائش کر رہا ہو۔

اے ندیم۔

تیرے دل میں حرص و آز کی آگ سلگ رہی ہے۔ اور تری آنکھوں سے خود غرضی کی چنگاریاں برس رہی ہیں۔ اگر تو لالچی، حریص۔ اور خود غرض نہ ہوتا۔ تو فرشتے تیرا پانی بھرتے۔ اور حوریں تیری چاکری کرتیں۔

اے ندیم۔

دردِ دل ہی لذت حیات ہے۔

یہ نہ بھول۔
کہ نفرت وحقارت۔ اور حرص و آز تجھے ہلاکت کے عمیق غار میں دھکیل دیں گے۔
اور تجھ سے تیری انسانی خوبیاں اور جوہر چھن جائیں گے۔

○

۷

ماہِ چہاردہم سے زیادہ حسیں۔

اور

پھولوں سے زیادہ نازک۔

محبوبہ۔

جب صبحِ بہاراں کی نسیم مشکبار بن کر

خراماں خراماں میرے آنگن میں آتی ہے۔

تو میں محسوس کرنے لگتا ہوں۔ جیسے دنیا بھر کے پھولوں کی بو باس

سمٹ سمٹا کر میرے سیہ خانہ میں آگئی ہے۔

وہ سکون بن کر ماحول پر چھا جاتی ہے۔

اور صبحِ ازل کا نور بن کر میرے مطلعِ حیات پر چمکنے لگتی ہے۔

فراق کی طویل ـــــ اور صبر آزما۔ راتوں کے بعد دیدِ حسنِ یار کی سحر آفریں

محبت میں وصل کی تمام لطافتیں نظر آتی ہیں۔
میں خوشی سے جھوم جاتا ہوں۔
اور وہ اپنی ناگن زلفوں کو ماحول میں پھیلا کر دل کی بانسری پر محبت کا میٹھا گیت گانے لگتی ہے۔
میرے آنگن کا ماحول موسیقی میں گم ہو جاتا ہے۔
اور میرا دل جذبات کی طوفان انگیز موجوں میں گم ہو کر رقص کرنے لگتا ہے۔
بانسری کی میٹھی اور پیاری لَے میں کائنات گم ہو جاتی ہے۔
اور اُس کا جادو۔
مجھے ایک بے دست وپا قیدی کی طرح — پابجولاں کر کے ایک ایسی دنیا میں لے جاتا ہے۔
جہاں نسل و رنگ۔ اور مذہب کی قدغن نہیں۔
جہاں محبت کے راستے میں رسم و رواج کی دیواریں حائل نہیں۔
جہاں۔ ذات پات کے جھوٹے بندھن نہیں۔
صرف محبت ہے۔ محبت۔
بے لوث محبت۔
جس میں ہوس و غلاظت نہیں۔
اور روح شکن تعفن نہیں۔

اور پھر۔

ہم دونوں مل کر ایک چشمہ کے کنارے پر بیٹھ کر اُس خدا کی حمد و ثنا کا گیت گاتے ہیں۔

جس کی غیر فانی محبت نے اِس کائنات رنگ و بو کو جنم دیا۔

○

۸

میرے ندیم۔

میں تیری تلاش میں بگولوں کی طرح آوارہ۔ اور بادِ بہاراں کی طرح حیران ہوں۔
اور صبح و مسا۔ ایک ایسے جوفی دائرے کے اندر رقص کناں ہوں۔ جس کے
خط عاشقاں باصفا کے آبلہ پا کے رستے ہوئے خون سے لگائے گئے ہیں۔

میں نے پہلی بار تجھے صبح ازل کو دیکھا تھا۔

تیری کشادہ پیشانی ماہتاب کی طرح چمک رہی تھی۔

اور تیری مدھر آنکھوں میں ایک سرمدی کیف تھا۔

تیری بھرپور جوانی۔ جو ازل سے ابد تک کبھی بڑھاپے میں تبدیل نہیں ہوگی
انتہائی کشش آفریں تھی۔

ترے جمالِ جہاں آرا میں کائنات گم تھی۔ اور آسمانوں اور زمینوں کی لطافتیں
اور نزہتیں سموئی ہوئی تھیں۔

تو نے محبت بھری نظر سے میری طرف دیکھا۔
اور میں نے تجھے اپنی اقلیم دل کا تاجدار منتخب کر لیا۔
تو چشمہ حیات تھا۔
اور میں سکندر کی طرح اب تک اس چشمہ کی تلاش میں ہوں۔
اور نہ جانے ۔ ابھی زندگی کی کٹھن اور دشوار ساعتوں میں اور کتنا عرصہ
تیری دید سے مجھے محروم رہنا پڑے۔

میں نے سنا ہے
مندر کا پجاری۔
مسجد کا ملا ۔
خانقاہ کا درویش
اور گرجے کا بوڑھا پادری
سب تیری ہی تلاش میں سرگرداں ہیں۔
لیکن ـــــ
اُن کی محبت ہوس سے لبریز۔ اور گناہ سے لتھڑی ہوئی ہے۔
میری محبت ـــ صرف تیری ایک دید پر قائم ہے۔
جس میں ہوس و آز نہیں ۔ اور وصل کی چاہت نہیں۔
میں صرف یہ چاہتا ہوں۔

ایک بار تیرے جلوۂ بے حجابانہ کو دیکھ پاؤں۔
اور پھر اس جمالِ دل افروز میں گم ہو کر
تری تلاش میں
پھر سرگرداں ــــ اور مصروفِ جہد ہو جاؤں۔
حتیٰ کہ ــــ زندگی کا یہ طویل اور کٹھن سفر ختم ہو جائے۔

○

۹

میرے محبوب۔

میں نے تجھے کس وقت اور کب پہچانا۔

جب زندگی کا کاروان طویل مسافت کے بعد ایک بگولے کی شکل اختیار کر کے منتشر ہونے کے قریب پہنچ گیا۔

مجھے اب محسوس ہوا کہ میں نے تجھے ابتدائے آفرینش میں صبح ازل کو دیکھا تھا۔

تیری ہر ادا سے شناسا ہوں۔

ترے جمال جہاں آرا کی جھلکیاں ابھی تک میرے نہاں خانۂ قلب کی عمیق گہرائیوں میں جلوہ طراز ہیں۔

اسی لئے زندگی ——— کے طویل ——— کٹھن۔ اور دشوار سفر میں بے تاب ہو کر پیہم اور مسلسل۔ تجھے پکارتا ہوں۔

اور اس فراقِ جانگسل میں میری زبان پہ صرف ایک صدا ہوتی ہے۔

میں تجھے جانتا ہوں۔

میں تجھے پہچانتا ہوں۔

تُو ــــــ نہ ملکہ محبت تھی نہ بھیکارن۔

میرے پریم مندر ــــــ کی جوگن ـــ اور پجارن تھی ــــ اور بس ــــ؟

تُو نے ــــ اپنی تیا کھی چِتوں ـــ کے نشتر سے میرے دل پر محبت کے نقش بنائے۔ تُو نے ــــ محبت کی آگ میں خود جل کر میرے سیہ خانہ دل کو منور کر دیا۔

میں ایک بے برگ و ثمر درخت تھا۔

تو نے پوجا کے پھولوں سے مجھے ہرا بھرا کر دیا۔

میں نے زندگی کے تمام مراحل میں تجھے موجود پایا۔

لیکن ــ پھر ــ ایسا وقت بھی آیا۔

ایسا دَور بھی آیا۔

کہ تو مجھے گرفتار زلست و وتا بنا کر۔ ایک ایسے دیس میں چلی گئی۔ کہ جہاں تک میری رسائی نہیں تھی۔

میں نے تنہائی ــ میں ــ فراق کے ظلمت افزا اندھیرے میں تجھے بار بار پکارا۔

لیکن تیرا جواب نہ پایا۔

میں مایوس ہو گیا۔

لیکن تیرے تصوّر نے میری رہنمائی کی۔

میرے گرم گرم آنسوؤں نے بھولی بسری یادوں کو تازہ کر دیا۔ اور فراموش شدہ افسانوں کو بیدار کر دیا۔

مجھے وہ حسین رات یاد آئی۔

جب بہار کی واپسیں نظریں۔ خزاں کی سُبک رفتار سواری کو آتے دیکھ کر خوفزدہ ہو رہی تھی۔

تو رنگا رنگ کے پھولوں میں گندھی ہوئی میرے گھر آئی۔ تیری شراب آگیں آنکھوں میں حسن تھا۔ کشش اور جوانی تھی۔ اور شراب شباب چھلک رہی تھی۔ میں نے ان شراب سے بھرے ہوئے پیمانوں میں اپنے آپ کو غرق کر دیا۔

اس وقت ـــــ میرا لڑکپن ـــــ جوانی کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔

اور تیرا شباب۔ چودھویں رات کے چاند کی طرح نکھرا ہوا تھا۔

تو نے میرے آتشیں رخساروں پر پھولوں کی چھڑی ماری۔

میرا جسم بید مجنوں کی طرح کانپنے لگا۔

میں نے محسوس کیا۔ کہ میری گستاخ نظروں نے ترے معصوم اور پھول سے رخساروں کی خوشہ چینی شروع کر دی تھی۔

اور تو نے اس گستاخی کی مجھے سزا دی۔

چھڑی مارنے کے بعد ـــــ تو اپنے خوبصورت پیازی ہونٹوں میں مسکرائی۔

تری مسکراہٹ سے کائنات کا ذرہ ذرہ مسکرانے لگا۔

دور— گوالے نے دامن کوہ میں بانسری کی مدھر سروں میں ہماری محبت کی راگنی الاپنی شروع کی۔

اور بانسری کی میٹھی سروں میں آسمان کے ستارے۔ اور زمین کے ذرے رقص کرنے لگے۔

میں نے جذبات کے تلاطم سے مجبور ہو کر تیرا دامن تھام لیا۔

اور تو— ناچتی ہوئی دامن چھڑا کر آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔

میری آنکھ کھلی۔

اختر سحر۔ آفتاب عالمتاب کو— آخری سلام کہہ کر رخصت ہو رہا تھا۔

تو مسکراتی ہوئی اپنی مسہری سے اٹھی۔

تری کمر تک بل کھائی زلفیں۔ شانوں پہ بکھری ہوئی تھیں۔

انگیہ کے بندھ ڈھیلے پڑے ہوئے تھے۔

ساڑھی کے شکن۔ ایک طویل کشمکش کی خبر دے رہے تھے۔

تو نے ایک نگاہ نیم باز سے میری طرف دیکھا۔

اس نظر میں شوخی تھی۔ اور قدرے حیا۔

میں نے بچشم نم— تری طرف دیکھا۔ جیسے میں اپنے گناہ اور گستاخی کا اعتراف کر رہا ہوں۔

تو نے شرم سے— اپنا خوبصورت کتابی چہرہ— موڑ لیا۔ اور آتشیں گلگلی

دوپٹہ کے آنچل سے ڈھانپ لیا۔ اس باریک دوپٹہ کے مہین پردے سے تری نرگسی اور شرابی آنکھوں کا حسن چھن چھن کر میرے قلب کے گرد حالہ بنانے لگا۔ اور تیری سوئیوں کی طرح کھڑی مژگان کے تیر میرے سینہ میں پیوست ہو گئے۔

میرے خوشی کے نغمے آہستہ آہستہ فراق کے جان گداز گیتوں میں تبدیل ہونے لگے اور میرے نغمۂ فراق میں تیرا تصور جھیل سوز و گداز بن کر سما گیا۔

میرے نغمہ کی موسیقی نے کلیوں کو کھلا دیا۔ اور ہر نیوں کو چوکڑیاں بھرنی سکھا دیں۔

یہ سب تیرے حسن کا اعجاز تھا۔ جس نے میرے نغموں کی شکل اختیار کر لی تھی۔

پھر نصف شب گئے۔ تو موسم سرما کی خوبصورت چاندنی بن کر میرے مکان کے بند کواڑوں پر دستک دینے لگی۔

اس وقت میرا دل بے حد بے قرار تھا۔

اور میری روح تیرے خیال میں محو پرواز

میری آنکھیں گرم گرم آنسوؤں سے تر تھیں۔

اور میرے گیت — تیرے حسن کے جادو کے آئینہ دار۔

مجھے اتنا یاد ہے کہ تیری نیم باز۔ نیناں اور آنکھوں کے گلابی ڈوروں میں میری پلکیں جھپک رہی تھیں۔

اور تیری خوبصورت آنکھوں سے آبدار موتیوں کی لڑیاں ایک تسلسل کے ساتھ گر رہی تھیں۔

شاید۔ تو اُس فراق کی ساعتوں سے بچشمِ نم تھی۔ کہ جس کا آغاز جلد ہی ہونے والا تھا۔

تو میری حرماں نصیبی پہ کانپ رہی تھی۔

اور تیری سیاہ ناگن زلفیں شانوں پر بکھر کر فضاؤں میں لہرانے لگی تھیں۔

اور تیری خوبصورت آنکھوں میں محبت نے جو جوت جگائی تھی۔ ان میں میری آنکھیں انتہائی خوبصورت معلوم ہونے لگی تھیں۔

محبت اور ہمدردی کی جوت۔

اے قرارِ جاں۔

میں نے جذبات کے تلاطم کی طغیانی افزا موجوں سے مجبور ہو کر تری گداز بانہیں پکڑ لی۔

تیری گلابی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

اور آنسوؤں کی یہ دھارا تیرے سُرخ و سپید رخساروں کو سیراب کرتی ہوئی تیرے دوپٹے کے ریشمیں پلو میں جذب ہو گئی۔

میں نے محسوس کیا۔

کہ میں نے تیرے غرورِ حسن کو ٹھیس لگائی ہے۔

لیکن اب کیا ہو سکتا تھا

کمان سے نکلا ہوا تیر۔ اور ندی سے گزرا ہوا پانی کبھی واپس نہیں آتے۔

میں نے انتہائی وارفتگی کے عالم میں۔۔۔ تجھے پکارا۔

اے من مندر کی دیوی۔

اے کائنات کے حسن جمیل۔

اے جان بہاراں۔

اتنی سی بات پر — یہ طوفان جذبات۔

ترا مرجھایا ہوا چہرہ — سدا بہار پھول کی طرح کھل گیا۔

تیرے لالہ گوں ہونٹوں پر تبسم کی لہر دکھائی دینے لگی۔

اور تری کشادہ اور چاندسی پیشانی پر شرم و حیا سے پسینہ کے قطرات چمکنے لگے۔

تو نے وارفتگی شوق میں دونوں مرمریں باہیں میری ندامت سے جھکی ہوئی گردن میں حمائل کر دیں۔

تو مجھے ایک نئے جہان میں لے گئی۔

میں اس جہان کا ایک اجنبی مسافر تھا

جسے اس کے حسین اور لطافت افزا راستوں کا علم نہ تھا۔

اس جہان کے لوگوں نے مجھے اجنبی سمجھ کر میرا تمسخر اڑانا شروع کر دیا۔

میرے حال زار پر خوب ہنسے۔

لیکن تو نے مجھے قدم قدم پر سہارا دیا۔

اور

وادی عشق و محبت کے تمام نشیب و فراز سے آگاہ کیا۔

میرے پیار کو موسیقی دی ۔ اور محبت کو استقلال بخشا۔

دنیا بھر نے ہماری محبت کا تمسخر اڑایا۔

طعن و تشنیع اور لعن وطعن کے تیر برسا کر ہمارے دلوں کو مجروح کرنے کی کوشش کی۔

ملامت کا یہ طوفان ۔ اور مخالفت کی یہ آندھیاں بھی ۔ تیری محبت کی اٹل چٹان کو اپنی جگہ سے نہ ہلا سکیں۔

مذہب کے سوداگروں نے مذہب کے نام پر دو پاک روحوں کو جدا کرنے کی انتہائی کوشش کی ۔ لیکن یہ تیرا مستحکم عزم تھا۔ اور ناقابل تسخیر ہمت کہ ان اجارہ داروں کی کوئی پیش نہ چل سکی۔

تو نے مجھے گلے کا ہار بنائے رکھا ۔

تو نے میرے آنسوؤں کو قیمتی موتی تصور کیا۔

تجھے میری غربت میں امارت کی جھلکیاں نظر آئیں ۔

بارہا ۔ میں نے متاع صبر و سکوں ۔ کا خزانہ ترے قدموں پہ نچھاور کیا۔

چند گرم آنسو۔

کچھ آتشیں گیت ۔

کچھ حسیں نغمے ۔

خودداری ۔ اور سکوں کی تھوڑی سی دولت ۔

یہی میری ساری کائنات تھی ۔

جسے میں نے تیرے قدموں میں ڈالا۔

تو نے ایک غریب اور بیکس شاعر کے اس حقیر تحفہ کو اپنی محبت کے عوض خرید لیا۔ تو نے دنیا کی مخالفت کے باوجود شرابِ عشق و محبت کے جرعے مجھے پلائے۔

اور تو میری محبت پر بضد رہی۔

اے پیاری محبوبہ۔

محبت کے اس عظیم راز سے تم واقف ہو۔ نہ میں۔ صرف وہ کسک اور ٹیس ہی اس حقیقت سے آشنا ہے۔ جو آنکھوں کے ملاپ۔ اور دلوں کے اختلاط اولیں سے سینہ میں پیدا ہوئی۔

عدم واقفیت کے باوجود۔ میں نے محبت کی صبح اوّل یہ محسوس کیا۔ کہ ہم — دیرینہ ساتھی ہیں۔ جنھیں زندگی کی طویل مسافت مل جل کر طے کرنی ہے۔

تجھے دنیا کے ظالم ہاتھوں نے معصیت کے تاریک جنگل میں تنہا چھوڑ دیا۔

تیری آرتی کی تھالی کو ٹھوکر مار دی۔

تری مالا کے دانوں کو بکھیر دیا۔

اور تجھے اسفل ترین مخلوق سمجھ کر زمین میں دھنس جانے کی بددعا دی۔

اے معصوم کلی۔ اے پاک دیوی۔

تو نے یہ سب کلفتیں برداشت کیں۔ یہ سب مصائب جھیلے۔

جب پہلی بار — تری نظر — میری آوارہ آنکھوں سے ملی۔ تو تجھے احساس

ہوا — تو سرتاپا شباب — اور شعر مجسم ہے۔

تو مسکرائی۔

اور میری شاعری کی کائنات میں ہیجان برپا ہو گیا۔

اور مضراب کے بغیر میرے سازِ حیات سے نغمے پھوٹ پھوٹ کر نکلنے لگے۔

میری روح ان نغموں میں سما گئی۔

یہ گیت — تیری محبت کے گیت تھے۔

میں ان گیتوں کے اس فقرے میں کھو گیا۔

تو مجھے جانتا ہے۔ صبحِ ازل سے پہچانتا ہے۔

جب شیام متھرا کی فضاؤں میں پہنچ کر رادھا کو بھول گیا۔

جب نل دمینتی کو جنگل میں چھوڑ کر چلا آیا۔

شاید رادھا اور دمینتی نے نل اور شیام کے دجوگ میں یہی پرسوز گیت گایا تھا۔

اور جب شگفتہ جنگلی پھولوں کے ہار گوندھتی محبوت کی یاد میں بے تاب ہو جاتی تھی تو وہ بھی یہی گیت الاپتی تھی۔ — یاس آفریں گیت۔

دشت و جبل اور صحرا و بیابان میں مہادیو کی یاد میں پاربتی فراق میں مضطرب ہو کر مدھر سروں میں یہی نغمہ گاتی تھی۔

اے میرے ندیم۔

میں تمہیں جانتی ہوں۔
اور ابتدائے آفرینش سے پہچانتی ہوں۔
اس وقت میرا شباب کروٹیں لے رہا تھا۔
میں تیرے عکس جمیل کو دل میں بسا نہ سکا۔
صرف ترے نغموں کی لَے کو دل میں جگہ دے کر اور اسی کے کیف سرمدی میں مدہوش ہو کر ایک طویل سفر پر روانہ ہو گیا۔
میں نے جنگل و صحرا
کوہ و بیابان کو
تیری تلاش میں چھان مارا۔
تیرے فراق میں مجھے تن من کا ہوش نہ رہا۔
گومتی کے نشاط افزا کناروں پر دل میں تری یاد نے چٹکی لی۔ اور آہوئے رم خوردہ کی طرح تڑپا گئی۔
میں تیری یاد میں اُس ہرنی کی طرح دیوانہ وار تجھے ڈھونڈتا پھرا۔ جس کا بچہ اُس سے بچھڑ گیا ہو۔ میرے دلدوز نالوں۔ اور گرم گرم آہوں نے جنگل میں آگ لگا دی۔
جنگل کے پھول۔ ندی کی لہریں۔ اور طائرانِ خوش گفتار سب ہی میرے ہم جلیس ہو کر میرے درد انگیز گیتوں کی زبان بن گئے۔ اور میرا دل آتشِ فراق کی

تپش میں بریاں ہونے لگا۔
میرا عشق۔ منزلِ مقصود کی تلاش میں آوارہ و پریشان ہو کر اُس بستی کی طرف بھاگا۔ جس بستی میں محبت کی حکومت ہے؟
میں نے محسوس کیا۔
جوانی کا زمانہ ایک طویل آہ کے سوا کچھ نہیں۔
یہ تو میں جانتا ہوں۔ کہ زندگی چلتی پھرتی دھوپ چھاؤں ہے۔
لیکن تیری یاد دائم و قائم ہے۔
جو ہمیشہ نکہت بہاراں بن کر میرے دل میں سماتی رہتی ہے۔

میرے دل میں تیری محبت نے وہ آگ بھڑکا دی ہے۔
جس کی طپش سے میری پیاس بھڑک اٹھی ہے۔
ایک ایسی تشنگی۔ جسے دریائے محبت کی دو بوندیں بجھا سکتی ہیں۔
الٰہی۔ اس پیاس کی کوئی حد بھی ہے۔
میرے ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئی ہیں۔
اور میرا حلق سوکھ کر کانٹا ہو گیا ہے۔
مجھے عشق کے بحرِ ناپیدا کنار میں غرق کر دے۔
تاکہ۔ میری بھڑکی ہوئی پیاس کو تسکین حاصل ہو۔

اے ساقی سیم تن۔
ایک دو جرعے میری پیاس بجھا سکیں گے۔
میں دریا نوشی کا عادی ہوں۔
میں قلزمِ آشامی پر اتر آؤں تو سمندر خشک ہو جائیں اور دریا پایاب نظر آنے لگیں۔
یہ سب تری محبت کے کرشمے ہیں۔

تو کہاں ہے!
اے میرے محبوب۔
تیرے بغیر — یہ دنیا میری نظروں میں تاریک ہو گئی ہے۔
اور۔
میرا سکون چھن گیا ہے۔
اور۔
راتوں کی نیند حرام۔
میں — راتوں کو اختر شماری کرتا ہوں۔
اور — دن بھر تیرے فراق — کوچہ و بازار کی خاک چھانتا ہوں۔
قدم قدم — پر — آفت جان — دوشیزاؤں کے جھنڈ کے جھنڈ میری

نظروں کے سامنے سے گزر جاتے ہیں۔

لیکن قسم ہے تمہارے حسن جمال افروز کی

کہ۔ ان میں سے کوئی بھی تیرے جمال جہانتاب کی تاب نہیں لا سکتا۔

دل۔ ایک اندھے کی طرح ان کے پاؤں کی چاپ پر چند قدم اُن کے تعاقب

میں جاتا ہے۔ لیکن پھر بے نیل ہو مرام لوٹ آتا ہے۔

کاش۔

میرے سیہ خانہ قلب کو تیری ایک نگاہ غلط انداز سکون غیر فانی بخش دے۔

اور۔ میرے دھڑکتے ہوئے دل کو قرار کی دولت سے مالا مال کر دے۔

کاش۔

تو پھر لوٹ آئے۔

اُسی طرح۔ جس طرح خزاں کے بعد بہار مسکراتی ہوئی لوٹ آتی ہے۔

سوکھے ہوئے۔ بے برگ درخت ہرے بھرے ہو جاتے ہیں۔

پھول قہقہہ زن ہو جاتے ہیں۔

کلیاں غنچے بن جاتی ہیں۔

اور غنچے۔ پھولوں میں تبدیل ہو کر باغ کی روش روش پر بہار کی دولت

بکھیر دیتے ہیں۔

یہ حسینانِ گل اندام میری غربت و وحشت کی ہنسی اڑاتی ہوئی میرے قریب سے گزر جاتی ہیں۔

اور کوئی چنچل حسینہ۔

میرے دروازے کے قریب پہنچ کر انتہائی شرارت آمیز لہجہ میں پوچھتی ہے۔

بھیکاری ۔ بھیک لے گا؟

آہ۔

تیرے فراق میں ۔ یہ روزِ بد بھی مجھے دیکھنا پڑا۔

یہ کلمۂ آزار بھی سننا پڑا۔

تو کیا جانے۔

کہ اِن الفاظ سے میری خودداری کو کس قدر ٹھیس لگتی ہے۔

میرا دل خوں خون ہو جاتا ہے۔

اور میری آنکھوں سے ساون کی جھڑی لگ جاتی ہے۔

جب یہ چنچل دوشیزائیں بھیک کا پیالہ میری طرف بڑھاتی ہیں۔

تو میرا غرور بیدار ہو جاتا ہے۔

میری خودداری تن جاتی ہے۔

اور میری زخمی عزتِ نفس بپھرے ہوئے دریا کی طرح پھنکارنے لگتی ہے۔

میں اس پیالے کو حقارت سے ٹھکرا دیتا ہوں۔

اور یہ چنچل دوشیزائیں ـــ مجھے ـــ وحشی ـــ دیوانہ ـــ اور خبطی ۔ کہتی ہوئی بھاگ نکلتی ہیں۔

جب میں تیرے فراق میں پیچ و خم کھاتی ہوئی شاہراہ کے کنارے بیٹھ کر دو تارے پر تری محبت کے گیت گاتا ہوں۔

دردناک لے میں ـــ محبت کے گیت۔

تو سڑک پر چلتے ہوئے ہزاروں انساں میرے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔

اور حیرت و تردد سے میری طرف دیکھنے لگتے ہیں۔

میں بھیک نہیں مانگتا۔ صرف بھیک کے پردے میں سرمایہ حیات مانگتا ہوں۔

یہ دنیادار اُس راز سرمدی کو کیا سمجھیں۔ جو تری محبت نے میرے سینہ میں مخفی کر دیا ہے۔

یہ فانی مخلوق۔ پہلے میری ہنسی اڑاتی ہے۔ اور پھر خود ہی سر پیٹتے ہوئے یہ لوگ میری وحشت و دیوانگی سے بھاگ جاتے ہیں۔

لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں۔

کہو۔ کیا چاہتے ہو۔

تم ہی کہو! ۔ اے میرے ندیم ۔ کہ میں انھیں کیا بتاؤں؟

من کی طلب تن کا ہوش بھلا دیتی ہے۔

میں تو وحشی ہوں۔

وحشی۔

جو آہوئے رم خوردہ کی طرح اپنے سائے سے بھی بھاگتا ہے۔

یہ کون ہے؟

جس نے مجھ پر حسن کا جادو اور محبت کا فتر پھونک کر۔

دنیا کی ہر چیز سے بے نیاز کر دیا ہے۔

مجھے دنیا کی ہر چیز میں تیرا ہی جمالِ جہانسوز نظر آتا ہے۔

اے صبح کی دیوی۔

اے شب کی لیلے۔

اے آفتاب کی تمازت۔

اے چاند کی ٹھنڈی اور پیاری چاندنی۔

موسم تبدیل ہوتے ہیں۔

خزاں کے بعد بہار

اور گرمی کے بعد سردی اور برسات آتی ہے۔

اسی چکر میں ہر چیز مڑ مڑ کر پھر آتی ہے۔

لیکن اے راجکماری۔

تو ایسے دیس میں گئی ہے۔

کہ تجھ پر نہ میرے گیت اثر انداز ہوتے ہیں۔

نہ دعائے نیم شبی۔

نہ نالہائے سحر۔

نہ آہِ سرِ شام۔

دیکھ۔ میرے لاغر تن میں روح اس طرح پھڑپھڑانے لگی ہے۔

جیسے طائرِ پر شکستہ۔ آشیانہ کی طلب میں زمین پر بسملانہ رقص کر رہا ہو۔

میں نے جب بھی تجھے عالمِ وارفتگی میں پکارا۔

جب بھی چاکِ گریبانی کے عالم میں تجھے صدا دی۔

تیری ہی آواز میرے کانوں میں لوٹ کر ٹکرانے لگی۔

میں یہ سمجھا۔ کہ شاید تو لوٹ آئی ہے۔

لیکن آنکھیں کھلیں۔

تو ایک سراب تھا۔ جس کے فریب میں پھنس کر میں نے جہاں کو تیاگ دیا۔

۱۰

میرے ندیم۔

جب میں تیرے آستانۂ جلال پر پہنچا۔

تو میرے پاؤں کے آبلے رس رہے تھے۔

اور دریدہ لباس کے نیچے سے میرے جسم سے خون کے چھوٹے بڑے

دھارے بھر رہے تھے۔

دل میں ایک خلش تھی۔

اور میری منتظر آنکھوں کی سوزش نے سرخ ڈوروں کو عمیق کر دیا تھا۔

میری ہر صدا نغمہ۔ اور ہر آواز گیت کی شکل اختیار کر چکی تھی۔

میں نے محسوس کیا۔

تیری قرابت کا تریاق زہرِ عشق کے لیے یہاں قاطع ہوگا۔

میں نے تیرے آستاں کے سامنے۔ اپنا کشکول۔ اور فقیری کا چمٹا رکھ دیا۔

میرے پاؤں میں کانٹے تھے۔
تو نے انسانی ہمدردی کا مظاہرہ کیا۔
اور کہا
لاؤ۔ مسافر میں تمہارے پاؤں کے کانٹے نکال دوں۔
کہو۔ کہاں درد ہے۔ اور کس جگہ چبھن ہے۔؟
لیکن مَیں تری زبان کو نہ سمجھ سکا۔
میں ترے راز کو نہ پا سکا۔
میں نے تیرے جمالِ جہانسوز میں جلنے کو ہی عشق سمجھا۔
اور کانٹوں کی چبھن کو محبت کی متاعِ عظیم۔
میں نے تیری پیشکش کو ٹھکرا دیا۔
اور آنے والے وقت کا منتظر۔ اور اُس مقام کی تلاش میں سرگرداں رہا۔
جہاں من و تو کی مصنوعی حدود ختم ہو کر۔ حسن۔ عشق میں اور عشق۔ حسن میں
جذب ہو جاتے ہیں۔

۱۱

ناکامیوں کے مسلسل تھپیڑے کھانے کے بعد
جب وہ تھک ہار اور مایوس ہو کر
اپنے گھر کی چوکھٹ پر پہنچا۔
تو تاریک رات کھڑی سائیں سائیں کر رہی تھی۔
اور باد شمال کے تند اور یخ بستہ جھونکوں کے ساتھ آسمان کے دریچوں
سے روئی کے گالوں کی طرح برف گر رہی تھی۔
اس کے پاؤں سے خون بہہ رہا تھا۔
اور اس کی آنکھوں سے آنسو۔
پھٹے پرانے لباس میں ببول کے کانٹے چبھے ہوئے تھے۔
وہ مایوسی کا مجسمہ تھا۔
چوکھٹ پہ کھڑے ہو کر اس نے درد بھری آواز میں کہا۔

"ماں"

بوڑھی ماں نے انتہائی اشتیاق میں محبت سے اپنے دونوں بازو پھیلا دیئے۔
اور اُس کی گرد آلود پیشانی پر محبت کا بوسہ دیا۔

مایوسی اور ناکامی کی ظلمت میں — ماں کی مامتا۔ چراغ سرِ راہ کی طرح جگمگا اٹھی۔
اور اُس کی آغوش — پھولوں بھری مسہری بن گئی۔

اُس نے اپنا کانٹوں اور گرد میں اٹا ہوا سر۔ ماں کی گود میں ڈال دیا۔
اور — ماں کی میٹھی لوریوں اور محبت بھری تھپکیوں نے اُسے سکون و راحت کی نیند سلا دیا۔

ایک آوارہ و سرگرداں — اور پریشان و دیوانہ حال۔ مسافر۔ کو سکون نصیب ہوا۔ تو شفقت مادری کے سایہ میں۔

اس کے آوارہ گیت — اور درد انگیز نغمے مہرِ مادری کی محبت بھری فضاؤں میں گم ہو گئے۔

اور وہ ماں کے پاؤں میں جنت پا کر۔
دنیا کی تمام لذتوں اور لطافتوں سے بے نیاز ہو گیا۔

○

۱۲

میرے ندیم۔

وقت نے پھر مجھے دھوکا دیا۔

حالات نے پھر پلٹا کھایا۔

اور میں ایک الہڑ دوشیزہ کی دہقانی مسکراہٹ پر فریفتہ ہو کر اپنے راستہ سے بھٹک گیا۔

اُس جادۂ صدق و صفا سے ہٹ گیا۔

جسے میں نے تری محبت میں اپنے لئے تجویز کیا تھا۔

میں ایک اناڑی شکاری کی طرح جو ہرنوں کے غول کو دیکھ کر اپنے اصل شکار کو بھول جاتا ہے۔ اپنے جادۂ مستقیم کو چھوڑ کر حسن کی فریب کارانہ پر پیچ بھول بھلیاں میں کھو گیا۔

ایک سراب کو چشمۂ آبِ حیوان سمجھ کر۔ تشنہ لب مسافر کی طرح اس

کی طرف بھاگتا رہا۔

میں نے قدم قدم پر ٹھوکر کھائی۔

منہ کے بل گرا۔

اٹھا۔ اور پھر۔ اس سراب کے پیچھے چل دیا۔

لیکن۔

افسانہ۔ حقیقت نہ بن سکا۔

اور ملمع۔ سونا۔ میں تبدیل نہ ہو سکا۔

میرے غرورِ عشق کی یہ تذلیل۔

میرے جذبۂ خلوص کی یہ رسوائی۔

ناقابلِ برداشت تھی۔

میرے سینے میں انتقام کی آگ بھڑک اٹھی۔

اور بغاوت کے یہ شعلے۔ آسمانوں کو چیر کر۔ اُس خدائے قہار کی طرف لپکے

جو سارے مصائب و آلام کا محرک ہے۔

میں نے نقیبِ تخریب۔ اور صورِ قیامت بن کر۔ فریب کے چکر کو توڑ دیا۔

میں نے خون کے چھینٹوں اور آگ کے شعلوں سے عشق کو غسل دیا۔

میں نے ہوس و نفس پرستی کا جامہ پہنا کر اُسے جادۂ حسن کا شہوار بنا دیا۔

وہ شہرِ انتقام پر سوار ہو کر۔ حسن کے مرمریں گھروندوں کو ہر طرف پائی

تلے روندتا پھرا۔

کتنی معصوم کلیاں اُس کی ہوس کی بھینٹ چڑھ گئیں۔

کتنے نیم وا غنچے۔ اُس کے پاؤں تلے روندے گئے۔

کتنے۔ پھول۔ اُس کی مسہری کی زینت بن گئے۔

اُس کی ہوس نے کلیوں کو غنچوں۔ اور غنچوں کو پھولوں میں تبدیل کر دیا۔

لیکن انتقام کی آگ ٹھنڈی نہ ہوئی۔

بلکہ اور بھڑکتی گئی۔

معصیت اور گناہ کے تیل نے اِسے اِتنا بھڑکا دیا۔ کہ وہ شعلہ جوّالا بن گئی۔

لیکن۔ اے خلوص کی دیوی۔

اے پیکرِ مہر و وفا۔

ترے گرم گرم آنسوؤں کے پانی نے ہوس کی اس آگ کو ٹھنڈا کر دیا۔

تری پرخلوص محبت کے وجد نواز گیتوں نے۔

آتشِ انتقام کو۔ گلزار صدق و صفا میں تبدیل کر دیا۔

تو نے چراغِ سرِ راہ بن کر۔ ایک بھٹکے ہوئے راہی کو سیدھا راستہ دکھایا۔

تو نے سراب کے پیچھے بھاگنے والے فریب خوردہ مسافر کا ہاتھ پکڑ کر اُسے چشمہ

آبِ حیوان پر پہنچا دیا۔

یہ تیرا خلوص محبت ہی تھا۔

جس نے حیوان کو انسان کا روپ بخش دیا۔

۱۳

اے محبوبہ۔

میں نے تیری یاد میں اپنے گرم گرم آنسوؤں سے ستاروں کی آب یاری کی۔

میں نے آتشیں آہوں کے ستاروں کو روشنی بخشی۔

اور دل دوز نالوں سے بلبل کو سوز دیا۔

میں نے تیری طلب میں۔

موت وہ آغوش طوفانوں کا مقابلہ کیا۔

اور آندھیوں اور طوفانوں کے منہ موڑ دیئے۔

تیری یاد میں قدم قدم پہ سجدے کیئے۔

یہ سمجھ کر۔ کہ شاید اس جگہ تیرا نقش کف پا نہ آیا ہو۔

لیکن تیرے تکبر اور غرور کے ہتھوڑے نے میرے آئینۂ دل کو چور چور کر دیا۔

لیکن تری اس بے وفائی پہ خوب رویا۔

میرے آنسوؤں نے سیلاب کی شکل اختیار کر لی۔
میری آہیں آتش فشاں پہاڑ کے دہانے کی طرح لاوا اُگلنے لگیں۔
میری بے زبان زبانِ قضا بن کر صورِ قیامت پھونکنے لگی۔
میں نے کہا۔
لاؤ میرا ترکش۔ جس کے تیر زہر میں بجھے ہوئے ہیں۔
اور میری کمان جو مگرمچھ کی ریڑھ کی ہڈی سے بنائی گئی ہے۔
کہ میری سواری کا آتشیں رتھ
اور خوں میں لتھڑی ہوئی شامی تلوار۔
تاکہ میں اس ہوس پرست اور معصیت آلود دنیا کو موت کے گھاٹ اتار دوں۔
اور اس کا گرم گرم لہو عزرائیل کے حلق میں انڈیل دوں۔
یہ معصیت آلود دنیا۔
اس قابل نہیں۔
کہ عباد نا۔ انسان۔۔ اس میں سکھ چین کا سانس لے سکیں۔
لاؤ۔ میرا کدال۔ کہ میں اسے بیخ و بن سے اکھاڑ کر اس کے کھنڈروں پر ایک
نئی دنیا تعمیر کروں۔
جس کی اساس۔۔ وفا۔ خلوص۔ محبت۔ دیانت۔ انصاف اور مساوات
پر ہو۔

۱۴

اے میرے محبوب۔

مجھے خوب یاد ہے۔

جب میں محبت کے رموز و اسرار سے ناواقف تھا۔

جب مجھے حسن کی عشوہ طرازیوں سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔

جب میں تیری سنبلیں زلفوں کے پیچ و خم سے ناآشنا تھا۔

تو محبت کی بھیک مانگنے کے لیے کئی بار میری کٹیا کے دروازے پر آئی۔

تو نے بار بار کٹیا کے دروازے کی چوکھٹ کو بوسہ دیا۔

تو نے ہر بار اپنی پرخلوص محبت کا یقین دلایا۔

اور مجھے اپنے دامِ فریب میں پھانسنے کی کوشش کی۔

میں ترے ہر فریب سے بچتا رہا۔

لیکن ۔۔ کب تک ۔۔ اور تا بہ کے ۔ آخر تو نے مجھے اپنی زلفوں کے تنگ

حلقوں میں جکڑ لیا۔
اور بھونرے کی طرح میرا رس چوسنا شروع کر دیا۔
میں نے اپنے آپ کو تیرے حوالے کر دیا۔
تو نے مجھے اپنا قیدی بنا کر۔ قدم ۔ قدم پہ مجھے ٹھوکر ماری۔
اور انتقام کے ہتھوڑے سے میرے آئینہ دل کو چور چور کر دیا۔
نگاہ التفات کے بعد تری یہ کور چشمی۔
اے حوا کی بیٹی۔ اگر آدم کا فرزند ترے جذبات کی یوں تذلیل و تحقیر کرتا۔
تُو تو انتقام میں کیا کچھ نہ کر گزرتی ؟
کیا کیا دشنام نہ دیتی ؟
میں سوچتا ہوں۔
کیا ہر دوشیزہ کا بوسہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ کہ دل کا داغ بن کر اُبھر آئے۔
نسیم سحر۔ گدگدا کر کلی کو پھول بنا دیتی تھی۔
لیکن یہ صرف بھونرا ہی جانتا ہے۔
کہ پھول کا سینہ کیسے اور کیونکر چاک ہوا۔

۱۵

اے دوشیزۂ بہار۔

میں تری سبک رفتار سواری کے ساتھ ساتھ اُس دیس کو چل دیا۔ جس میں نہ موت ہے نہ زندگی کی لطافتیں۔

صرف ایک ظلمت افزا سایہ ہے۔

جو ہمیشہ ساتھ ساتھ رہتا ہے۔

لیکن اُس پُر مسرت یاد کو فراموش نہ کر سکا۔

جب تو نے مجھے فرطِ انبساط میں ڈُبڈُبائی آنکھوں کے ساتھ الوداع کہی تھی۔

میں تری کشادہ پیشانی پر الوداعی بوسہ نہ دے سکا۔

لیکن ترے رس بھرے ہونٹ۔ میرے ہونٹوں پر پیوست ہو گئے۔

اور تری نرگسی آنکھیں۔ میری آنکھوں میں جذب ہو کر رہ گئیں۔

ترے الوداعی بوسہ کی بوباس سے اب تک میری مشامِ جاں معطر ہیں۔

ترے ہونٹوں کی مٹھاس نے موت کی تلخیوں کو آسان کر دیا ہے۔

اب میرے لئے موت کی جانکنی۔
کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔

میں ایسے دیس میں پہنچ چکا ہوں۔
جہاں زندگی اور موت کا احساس تک نہیں۔
ایک ایسی زندگی ہے ۔ جسے کبھی موت نہیں۔
جسے نہ زوال ہے نہ خزاں ۔
اس دنیا کا خمیر۔ تری محبت سے اٹھایا گیا ہے۔ اے میرے محبوب۔

۱۶

اے میرے محبوب۔
صرف ایک ہی آرزو ہے۔
اور ایک ہی تمنّا۔
جب یہ جدائی کی راتیں۔ طویل اور ڈراؤنی راتیں۔
ترے لئے پیامِ راحت بن جائیں۔
اور تو مجھے بھول جائے۔
تو اِس وقت!
کوئی آہستہ سے تیرے کانوں میں کہہ دے۔
وہ۔ جسے تم بھول چکے ہو۔
اِس جہان سے رخصت ہو چکا ہے۔
اب وہ پھر کبھی لوٹ کر نہیں آئے گا۔

وہ بندۂ مہر و وفا۔
وہ پیکرِ صدق و صفا۔
جو محبت کی ناکامیوں کا رازداں ہو کر شاعرِ لازوال بن گیا تھا۔

۱۷

کتنے انقلاب آئے۔

کتنی سلطنتیں بدلیں۔

کتنے تاجداروں کے تاج خاک میں ملے اور مملکتوں کے نشان ناپید ہو گئے۔

لیکن تو اسی طرح بہہ رہا ہے اور اسی طرح بہتا رہے گا۔

پہاڑیوں میں بل کھاتا ہوا۔ اور میدانوں میں بپھرتا ہوا

"انا" و لا غیری کے راگ الاپتا

برف کے تودوں سے پھسلتا۔ اور چٹانوں سے ٹکراتا۔

جھاگ اڑاتا۔ شور مچاتا۔ بپھرتا۔ اور بل کھاتا ہوا

بہا چلا جا رہا ہے۔ صدیوں سے۔ اور صدیوں تک بہا چلا جائے گا۔

نشیب و فراز سے بے نیاز۔

سر بلند اور بے گیاہ پہاڑ۔

نہ سیاہ اور سنگلاخ چٹانیں۔

نہ بھیانک جنگل اور لق و دق صحرا۔

نہ لہلہاتے ہوئے سبزہ زار اور وسیع و عریض میدان

ترے زور کو تھام سکے اور روانی کو روک سکے۔

صدیاں ہوئیں۔ تو نے اپنے وطن کو الوداع کہی تھی۔

اور پھر کبھی وطن کی خاک پاک کو بوسہ نہ دے سکا۔

ایک اُن تھک مسافر کی طرح۔ جو دن رات منزل کی آرزو میں بادیہ پیما

رہتا ہے۔

تو چل رہا ہے۔ کبھی آہستہ رو۔ اور کبھی تیز تیز۔

بَل کھاتے ہوئے خونخوار افعی۔

جب تو پھنکارتا۔ اور بپھر کر اپنی آبی پھن کو پھیلا دیتا ہے۔

تو آباد بستیوں۔ خوبصورت شہروں۔ اور رفیع الشان عمارتوں میں سوگ

کی صفت بچھ جاتی ہے۔

تو اژدر خونخوار کی طرح۔ موت کا پیامبر بن کر ہر طرف لپکتا ہے۔

تو طوفانِ نوحؑ۔ بن کر بستیوں کو ویرانوں۔ اور شہروں کو کھنڈروں میں تبدیل

کر دیتا ہے۔

تو اپنے خونی بازو۔ دور دور تک پھیلا دیتا ہے۔

اور اِن بازوؤں کی زد سے نہ بے زبان بچتے ہیں۔ نہ جاندار۔

نہ ویرانے محفوظ رہتے ہیں۔ نہ کچی اور پختہ آبادیاں۔

جو بھی ترے سامنے آتا ہے۔

تو اُسے اپنی وسیع آغوش۔ میں دبوچ۔ کر دیو اجل کا لقمہ بنا دیتا ہے۔

اِس وقت دنیا تجھ سے پناہ مانگتی ہے۔

اور جب اپنی لہروں کو سمیٹ کر تو اپنی اصلی حالت میں آجاتا ہے۔

تیرا غصہ اتر جاتا ہے۔

اور تو سکون و نشاط کا راگ الاپتا ہوا کسی مستِ خرام حسینہ کی طرح قدم قدم پہ گیت بکھیرتا۔ اور عشق و محبت کے صدیوں کے مخفی اور پوشیدہ راز واشگاف کرتا اپنی منزل کی جانب رواں دواں ہوتا ہے۔

اُس وقت۔۔ ترے کنارے۔ حسینوں کی مجلسوں سے معمور ہو جاتے ہیں۔

اور تو اپنے وسیع و عریض سینے کو کھول دیتا ہے۔

ترے سینے پر بادبانی کشتیاں۔ ڈونگے۔ اور شکارے۔ دخانی جہاز۔ اور چوبی بیڑے چلنے لگتے ہیں۔

حسیناں گل اندام۔ چاند کی روپہلی چاندنی میں۔ تیری شوخ و شنگ موجوں کے ساز پر محبت کے گیت گاتی ہیں۔

اور فرقت زدہ عشاق۔ تیرے کناروں پہ بیٹھ کر سکوں کے طالب ہوتے ہیں۔

عشق و محبت کی کتنی حسین یادیں ترے سبز و شاداب کناروں سے وابستہ ہیں۔
ایثار و قربانی کے کتنے افسانے۔ تیری کتاب حیات کا جُزو بن چکے ہیں۔
وصل کی کتنی داستانیں۔ ترے سینے میں صدیوں سے پوشیدہ چلی آرہی ہیں۔
تو نے اپنے ساحل کو تاجدار اور گودڑی پوش گڈریے کے لئے یکساں طور پر کھول رکھا ہے۔
ترے کنارے پہ بکری اور شیر دونوں یکساں طور پر اپنی پیاس بجھاتے ہیں۔
تو مساوات کا داعی ہے۔
تو انقلاب کا علمبردار ہے۔
صبح و مسا تیرے کناروں پر زندگی کا رقص ہوتا ہے۔ کبھی موت کا راگ چھڑتا ہے۔ کبھی خوشی کے ترانے گونجتے ہیں۔ کبھی قہقہوں کی گونج میں تری لہریں رقص کناں نظر آتی ہیں۔ اور کبھی ترے کناروں کے مرگھٹ کے شعلوں پر موجیں اشک افشاں دکھائی دیتی ہیں۔
تو خوشی اور غم کی ان ملی جلی کہانیوں کو اپنے وسیع سینہ میں چھپائے نامعلوم منزل کی طرف رواں دواں ہے۔
انسان نے ماضی میں ترے ریتیلے کناروں پر جو عبارت ثبت کی تھی۔ مستقبل نے اسے حرف غلط کی طرح معدوم کر دیا۔
انسان نے تیری شوخی اور طراری کو ختم کرنے کے لئے تیز بھالوں۔

نوکدار کدالوں ۔ اور دیوپیکر مشینوں سے تیرے پہلو کو کاٹ دیا۔ اور تیری آنکھوں کے پانی کو نہروں کے سینے میں سمو دیا۔

لیکن تو زخمی ہونے کے باوجود اپنی تندہی اور تیزی سے دست کش نہ ہوا۔ تو جب بھی بپھرا۔ تجھے جب بھی انسان کی بے رحمی کا احساس ہوا۔ تو طوفان اور سیلاب کی شکل اختیار کر کے میلوں میں پھیل گیا۔

اِس میں تیرا قصور نہیں۔ تری خطا نہیں۔

تو انسان کے ظلم کی صدائے بازگشت ہے۔

جس نے ایک مہیب طوفان ۔ اور ہلاکت خیز سیلاب کی شکل اختیار کر کے فطرت انسان کے لئے سامان عبرت مہیا کیا۔

گرمی سے ستایا ہوا گڈریا۔ جب تھک ہار کر تیرے کنارے درختوں کے جھنڈ کے سائے میں بیٹھ کر بانسری بجاتا ہے۔ اور پہاڑی راگ چھیڑتا ہے۔ تو تیری موجیں اپنے مولا کی یاد میں ناچنے لگتی ہیں۔ دوسرے کنارے پر پانی بھرتی ہوئی کوئی الھڑ دوشیزہ ــــ بانسری کی میٹھی اور وجد نواز سروں میں سر ملا کر "پی" کی یاد میں مدھر آواز میں گیت گاتی ہے۔ بانسری کی لے اور کنواری کا گیت تیری چاندی سی شفاف آبی سطح پر محبت کا غیر فانی نقش ثبت کر دیتا ہے۔

آسمان کے نیلگوں دریچوں سے چاند۔ تیری شوخ و طرار موجوں کی خم کھائی ہوئی نازک کمر میں نور کی کمندیں پھینک کر انھیں اپنی طرف کھینچتا ہے۔

آفتاب اپنی قرمزی اور طلائی شعاعوں کا جال ترے سینے پر بچھا دیتا ہے۔ اور خود اُس شکاری کی طرح جو "کنٹی" تم میں پھینک کر خود کنارے پر مچھلی کے پھنسنے کا منتظر رہتا ہے۔

آفتاب۔ دور۔ بہت بلندی پر۔ کھڑا۔ تیری آنکھوں کے آنسوؤں کے نہ ختم ہونے والے پانی کو حباب بنا کر اڑا تا رہتا ہے۔

حتیٰ کہ ترے خزانے آسمان پر جمع ہو جاتے ہیں۔

نیلا۔ اور بوڑھا آسمان۔ ان کے بوجھ کو برداشت نہیں کر سکتا۔ اور انھیں تیری طرف لوٹا دیتا ہے۔ کبھی بارش کی شکل میں اور کبھی برف کی صورت میں۔

اے بوڑھے دریا۔ تو ابتدائے آفرینش سے اسی طرح بہہ رہا ہے۔ اور صدیوں تک اسی طرح بہے چلا جائے گا۔

میں نے تمہیں بوڑھا کہہ کر غلطی کی۔

تیری توہین کی۔

تو صدیاں گزر جانے پر بھی جوان ہے۔ اور صدیاں گزر جائیں گی۔ اور

جوان رہے گا۔

نہ جانے وہ کونسی کشش ہے۔ جو تجھے بے مدعا و مقصود کھینچے جاتی ہے۔

قرن ہا قرن گزرنے کے بعد بھی تیرا سفر ختم نہیں ہوا۔ تیری منزل نظر نہیں آئی۔

کتنا اٹل۔ اور غیر متزلزل ہے تیرا عزم۔ تو ماضی کی طرف جھانکنے کے بجائے مستقبل کی طرف بھاگے چلا جا رہا ہے۔

اور تیری موجوں کی تندی اور لہروں کا ترنم۔ یہی راگ الاپ رہا ہے۔

کہ اِس دنیا کی اساس سفر ہے۔

اے مسافر۔ ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ نہ جا۔

بلکہ تیزی سے منزل کی طرف بڑھتا چلا جائے۔

راستہ میں اٹک نہ جا۔ ریت کی سنہری چمک دمک پر بھول نہ جا۔ اور اپنے آپ کو اس میں جذب نہ کر دے۔ یہ منزل نہیں سراب ہے۔

مضطرب نہ ہو۔ ترے سینے کی گندگی کو۔ جو تجھے صبح و مسا بے تاب اور بے چین رکھتی ہے۔ شاعر کے سینۂ سوزاں سے نکلا ہوا پاک پانی۔ آنسو بن کر پاک کر دے گا۔

اے مسافر۔ تھم نہیں ۔ رک نہیں ۔ پیچ و تاب نہ کھا۔ اور جھاگ اُڑا اُڑا کر اپنا حال بُرا نہ کر۔ دیکھ سمندر۔ اپنی وسیع آغوش کو وا کئے تیرا منتظر ہے۔ جیسے میرے آنسوؤں نے وسعت بخشی ـــــــ اور وہ آسمان سے ہم آغوش ہو گیا۔

۱۸

دل کے مندر میں بیٹھ کر اُس نورِ لم یزل کی تلاش کر۔ جو کبھی طورِ سینا پر چمکا۔
اور کبھی فاران کی چوٹیوں سے جلوہ نما ہوا۔
کبھی بیت المقدس کو منور کر گیا۔ اور کبھی متھرا۔ اجودھیا اور پاٹلی پتر میں گوتم بدھ
کو مدہوش بنا گیا۔

سب اُسی خدا کی مخلوق ہیں۔
سب اُسی کی پیداوار ہیں۔
پھر یہ امتیازِ رنگ و نسل کیا ہے۔
پھر یہ تفاوتِ من و تو کیا ہے۔
یہ سب اُن پنڈتوں ۔ مولویوں ۔ کاہنوں اور پادریوں کا پیدا کیا ہوا ہے۔
جنھوں نے اپنے حلوے مانڈے کی خاطر مختلف رنگ کے اڈے بنا رکھے ہیں۔
کتابوں میں وہ چھپا ہوا نہیں۔

نہ وہ مندر کی سپید جبیں مورتیوں میں۔

نہ مسجد کی صفوں اور محرابوں میں

نہ گرجا میں اور نہ آتش کدہ میں

وہ تو من مندر میں ہے۔

کعبۂ دل میں بیٹھ کہ اس کے جلووں کی تابانی کو سمیٹ۔

اس کے حسن کا جلوہ کر۔

یہی دل ہے جس میں خدا کی خدائی سمائی ہوئی ہے۔

یہی وہ کارزار حیات ہے جہاں کرشن نے گیتا کا درس دیا

یہی وہ طور سینا ہے۔ جہاں موسیٰؑ نے لن ترانی کی گونج سنی۔

یہی وہ فاران کا سلسلۂ کوہ ہے کہ جس کی چوٹی پر کھڑے ہو کر سید المرسلینؐ نے
تکمیل انسانیت کا منشور پڑھا۔

یہی وہ بہار آفریں سبزہ زار ہے۔ جہاں گوتم بدھ نے تیری آواز کو سنا۔ اور
راج پاٹ کو چھوڑ کر مظلوم انسانیت کو ظلم سے نجات دلانے کے لیے جنگل اور صحرا
پہاڑوں اور سبزہ زاروں کی دشت پیمائی کرتا پھرا۔

آ۔ اس دل کی اتھاہ گہرائیوں میں بیٹھ کہ اس کے جلووں کا نظارہ کر۔

اس دل سے بڑی سجدہ گاہ اور کوئی نہیں۔

۱۹

میں محبت کے گیت گاتا ہوں۔

اور مساوات کا پیغام سناتا ہوں۔

یہ سب لوگ لنگڑے۔ لولے لنجے۔ اور محتاج میرے ہی بہن بھائی ہیں۔

یہ گناہ کی بیٹیاں ——— طوائفیں

یہ بھوک کے مارے ہوئے انساں

یہ شرابی ——— یہ چور ——— اور ڈاکو۔

سب میرے ہی بہن بھائی ہیں۔

ان کے گناہ کا بوجھ میری گردن پر ہے۔

آدم سے لے کر آج تک ——— ہر انسان نے ——— عذاب کی

کند چھری سے ثواب کا گلا کاٹا ہے۔

یہ معصیت آلود انسان ـ یہ حوا کی بیٹیاں ـ اور آدم کے فرزند۔

ثواب کے پردہ میں معصیت کی پرورش کرتے ہیں۔
ثواب و عذاب سے بے نیاز ہو کر۔
شیطان کے اشارہ پر ناچتے ہیں۔
تسبیح و زنار کے جھگڑوں میں اُلجھے ہوئے انسان۔
مذہب کا بیوپار کرتے ہیں۔
بداخلاقی کے ترازو میں۔ ثواب و عذاب کی جنس کا وزن کرتے ہیں۔
خدا کی مخلوق کو فریب دے کر بغلیں بجاتے ہیں۔
خوش ہوتے ہیں۔
مسرت و شادمانی کے ڈونگرے برساتے ہیں۔
اور سمجھتے ہیں کہ
ہم نے بڑا کارنامہ سرانجام دیا ہے۔
اس کرہ ارض کے نصف سے زیادہ حصہ پر شیطان کا پرچم لہرا رہا ہے۔
اور گناہ کی حکومت ہے
اس وسیع مملکت میں۔
شجرِ اخلاق پر بداخلاقی کے پھول کھلتے ہیں۔
اِس دنیائے ناپائدار میں گناہ اور معصیت کے ماسوا رکھا ہی کیا ہے۔
اِس دنیا کے انسان۔ ثواب کے پردہ میں گناہ کو فروغ دیتے ہیں۔

حیا کے پردہ میں بے حیائی کو ترقی۔
سب انسان۔ گناہ کرتے ہیں۔
غریب کا گناہ ظاہر ہو جاتا ہے اور امیر کا گناہ اس کی دولت کے روپہلی اور طلائی غلافوں میں چھپ جاتا ہے۔
یہ دنیا۔ سبیہ خانہ ہے۔ جس میں مذہب پر ثواب کا پالان پڑا ہوا ہے۔

تسبیح و زنار کے پردہ میں تم اپنے گناہ کو چھپا سکتے ہو۔
ریاکاری کو سمو سکتے ہو۔
لیکن کیا تم نہیں جانتے۔
کہ پولیس کا وجود چوروں کی موجودگی اور فوج کا وجود دشمن کی آمد کا پتہ دیتا ہے۔
اسی طرح تمہاری پرفریب شکل و صورت ــــ تمہاری سیاہ کاریوں پر دلالت کرتی ہے۔

انسانوں کی بدکاریوں۔
اور ریاکاریوں۔ کو دیکھ کر
فرشتوں نے احتجاج کیا۔
اے مولائے کریم۔

ہم شب و روز تیری عبادت میں مصروف رہتے ہیں۔
تیرے نام کی مالا جپتے ہیں
تیرے نام کا ورد کرتے ہیں۔
لیکن تیرے لطف و کرم۔
اور نوازشات و برکات کی نظر
ہمیشہ ان خاک کے پتلوں پر رہتی ہے۔
جو تیرے احکام سے کھلم کھلا بغاوت کرتے ہیں۔
گناہ کرتے ہیں۔ اور اس پر اتراتے ہیں۔
آخر اس کی وجہ۔ اس کا سبب؟
خالق ارض و سما نے جب ملائک کا یہ شکوہ سنا۔
تو مسکرا کر ملائک کو جواب دیا۔
اے ساکنان فردوس بریں۔
تم کیا جانو۔
کہ اس خاک دان کا ہر پھول کانٹوں سے چھدا ہوا ہے۔
خاکیوں کی اس بستی میں۔
ہر لب زہر آلود ہے۔
اور ہر آنکھ۔ کاجل کی سیاہی میں معصیت کو چھپائے ہوئے ہے۔

اس فانی دنیا میں انساں کے لباس میں شیطان انسانوں پر حکومت کرتے ہیں۔

ملائک نے انتہائی عجز و انکسار سے جواب دیا۔

اے معبودِ حقیقی۔

ہمیں بھی اس خاک دان کی سیر کی اجازت دے۔ اس دنیا کی جہاں کلیاں غنچے بنتی ہیں۔ اور غنچے پھول۔ اور پھر پھولوں کی پتیاں فضا میں منتشر ہو کر پیوندِ خاک ہو جاتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے۔ دو افضل ترین فرشتوں ہاروت اور ماروت کو کرۂ ارضی کی سیر کے لئے دُکبڑی زمیں کی پیٹھ پر اتار دیا۔

ہاروت اور ماروت نے۔ اس جہانِ رنگ و بو میں ہر چیز کو مختلف پایا۔ قدم قدم پر دامِ ہمرنگ زمیں دیکھے۔

ذرہ ذرہ پر نقشِ فریب ثبت پایا۔

مٹھاس میں تلخی کی جھلکیاں پائیں۔

ماہتاب۔ کی ہزاروں پرچھائیاں سطحِ دریا پر موجوں سے آنکھ مچولی کرتی دیکھیں۔

مسکراہٹوں میں غم و اندوہ کا رنگ۔ تبسم میں بے باکی حیا سوزی۔ حسینوں کے مسحور کن گیت۔ جن کی دردناک لَے صد ہائے بازگشت بن کر بانسری کی فریاد

بن گئی ہے۔

اس جہاں رنگ و بو کی لطافتوں و نزہتوں میں یہ فرشتے ایسے گم ہوئے۔ کہ فردوس کی رنگینیوں اور رعنائیوں کو یکسر بھول گئے۔

خلانشین۔ خاکیوں کی زلف گرہ گیر میں ایسے گرفتار ہوئے کہ باغِ خلد کے گیت ان کے عبادت گزار دماغوں سے محو ہو گئے۔

ہر چیز نقش بر آب بن کر نہاں خانۂ دل و دماغ سے فراموش ہو گئی۔

اور یہ آتش نفس مخلوق خاکیان کرۂ ارض کی محبت کے دام میں پھنس گئی۔

ان ملائک کے پاؤں میں حسیناں جہاں کی چھلتے دار افعی کی طرح لہراتی ہوئی زلفیں زنجیر بن کر پڑ گئیں۔

اور یہ پا بجولان ہو گئے۔

سلسبیل کی شیرینی جام سفال کے سامنے پرِ کاہ بن کر رہ گئی۔

ریاضت و عبادت کی حکایتیں افسانۂ پارینہ ہو گئیں۔

اور جلیسان الوہیت۔ رندان خرابات کے ساتھ مل کر ساغر بکف اور میخانہ بدوش نظر آنے لگے۔

وہ وحشیوں اور دیوانوں کی طرح ہر اچھی شکل کے پیچھے بھاگنے لگے۔

بارگاہ رب العزت نے ملائک سے مخاطب ہو کر کہا۔

دیکھو اے ساکنان خلد بریں۔

ہاروت اور ماروت اپنی اصلیت اور حقیقت کو کیسے بھول گئے۔
اور ساکنانِ ارضی نے ان کی عبادت وریاضت کی متاعِ عزیز کو چھین کر انھیں
کیسے فاترالعقل بنادیا۔

اے ندیم۔
کتنی کشش اور دل فریبی ہے اس جہانِ فانی میں۔
کہ فرشتے بھی جہاں آکر اپنی حقیقت واصلیت کو بھول جاتے ہیں اور ریاضت و
عبادت۔ اور۔ زہد و تقویٰ کو فراموش کر کے اس کی رعنائیوں اور نزہتوں پہ فریفتہ
ہو جاتے ہیں۔
اے مادرِ گیتی۔
تیری بہار غیر فانی،
اور تیرا حسن لازوال ہے۔
اس وسیع و عریض دنیا پہ۔ جس کی حدود آسمان سے ملی ہوئی ہیں۔
جس کے قدموں پر آفتاب عالمتاب اپنی قرمزی شعاعیں نچھاور کرتا ہے اور
ماہ چہاردہم اپنی ٹھنڈی اور روپہلی چاندنی کا صدقہ اتارتا ہے۔
محبت کی حکومت ہے۔
جہاں خلوص کا سکہ چلتا ہے۔ اور۔ وفا کے منشور پر عمل کیا جاتا ہے۔

۲۰

عورت
تخلیق عالم کی اوّلین کڑی۔
عورت۔
صبح کی تجلّی۔ اور نسیم بہار۔ جس کے جھونکے۔ موسم خزاں میں بھی پھول کھلا سکتے ہیں۔
ایک ایسا گیت۔ جس کی موسیقی سے انتہائی تپش افروز دھوپ میں آسماں سے امرت برسنا شروع ہو جاتا ہے۔
ایک ایسا خنک آمیز سایہ۔ جس کے نیچے کشمکش حیات سے تھکے ہارے مرد سکھ چین کی سانس لیتے ہیں۔
عورت۔ سوز میں ساز ہے۔ جس کے نغمے غم و آلام دنیا سے بے نیاز کر دیتے ہیں۔

عورت - کرۂ زمہریر میں ایسی آگ - جس سے منجمد خون حرکت میں آکر رگ و ریشہ میں دوڑنے لگتا ہے - اور غیرت و حمیت کو گرما دیتا ہے -

عورت - کبھی آنسو ہے - اور کبھی خندۂ گل -

عورت چشمہ آب حیوان ہے اور مرد سر سے پاؤں تک تشنگی -

عورت - قوس و قزح - پھولوں کی رنگینی - شاخوں کی لچک - چاند کی ٹھنڈی چاندنی - اور سورج کی اولین کرن - جو ظلمت کو شکست دے کر دنیائے رنگ و بو میں اُجالا کر دیتی ہے -

عورت : وفا کی پیکر - کبھی سیتا - کبھی پاربتی - کبھی نور جہاں - اور کبھی ممتاز محل -

عورت - کے دم سے کائنات کی رونق -

عورت - جرعۂ بادۂ گلفام - جس کی کیف افروزی سے جوانی کی مستی - اور لڑکپن کی شوخی قائم ہے -

عورت - جسم انسان میں دھڑکتا ہوا احساس دل -

مرد - لق و دق صحرا - اور عورت اس بھیانک صحرا میں چشمۂ سلسبیل -

عورت - نہ ہوتی - تو مرد ایک عضو ناکارہ تھا -

عورت - نہ ہوتی - تو مرد میں نہ غیرت ہوتی نہ حمیت -

وہ عورت ہی تھی - کہ - جو - مرد - کو نو ماہ تک اپنے پیٹ میں اٹھائے پھری -

اور پھر - مرد - اس درد کا احساس تک نہیں لا سکتا -

جو۔ زچگی کے وقت عورت کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔

اس درد کے احساس سے زمین کانپ جاتی ہے۔ اور آسمان لرز جاتے ہیں اور ملائک سجدہ ریز ہو جاتے ہیں۔

عورت۔ وہ نغمۂ کن ہے۔ جس نے دنیا کو جنم دیا۔

عورت۔ ایسا شعر۔ جس سے موسیقی کے سوتے پھوٹتے ہیں۔

عورت۔ کبھی امن۔ کا۔ سفید پرچم۔ اور کبھی جنگ کی خونی آندھی۔

عورت۔ کبھی سہاگ کا نغمہ۔ کبھی بیوگی۔ کی دلدوز اور جگر خراش فریاد۔

عورت۔ فتح و نصرت کا عَلم۔ ایک ایسی چٹان۔ جو صبر و استقلال سے بنی ہے۔

عورت اور مرد کی مشترکہ کوششوں سے یہ کھیتی لہلہائی۔ مرد نے ہل چلایا اور عورت نے پانی دیا۔ کشت عالم سبز و شاداب ہو گئی۔

عورت نے بھیم اور ارجن کو جنم دیا۔

عورت کی گود میں کرشن اور گوتم کھیلے۔

عورت۔ ہی موسیٰؑ و عیسیٰؑ کی ماں کہلائی۔

عورت کی شفقت سے ہی مرد۔ مرد بنا۔

عورت نہ ہوتی۔ تو ہر طرف تاریکی ہوتی ـــــ اور انسان ـــــ ہر طرف ٹامک ٹوئیے کھاتے پھرتے۔

مجاہد کی تلوار کو عورت کی ہمت افزائی نے ہی پرچم فتح و نصرت بنایا۔

عورت ـ مرد کی نخوت کو دھوتی ہے۔
تاریخ عالم میں جن مردوں نے نام پیدا کیا۔
اُن سب کو عورت نے ہی جنم دیا۔
ماں ـ کی تربیت ـ نے مِس خام ـ کو ـ سونا بنا دیا۔
مرد کی وفا نا آشنا۔ آنکھوں میں عورت نے ہی محبت کا کاجل لگایا۔

مرد ـ ہوس کا پتلا ـ وفا نا آشنا۔ ایک ایسا بھونرا۔ جو ہر آن ایک نئے پھول کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔
اس نے جس گود میں پرورش پائی۔ اس نے اسے ہی موت کے گھاٹ اتارا۔
مرد کے ظلم سہہ کر عورت کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔
وقت بدل گیا ہے۔
اور حالات تبدیل ہو گئے ہیں۔
اب عورت کو پابجولاں نہیں رکھا جا سکے گا۔
توڑ دو ان بندھنوں کو
غلامی کی تاریک رات ختم ہو گئی ہے۔ اور آزادی کا آفتاب طلوع ہو چکا ہے۔

اے نادان مردو۔ کسی غلط فہمی اور فریب میں مبتلا نہ رہو۔
تم عورت کو غلام بنانے کے لئے جو پھندے تیار کرو گے۔
مستقبل کے ہاتھ یہی پھندے تمہارے گلے کے طوق بنا دیں گے۔
عورت کی مظلومی کی طویل داستان ختم ہو چکی ہے۔
عورت کی مظلومی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اسے تڑپانے والو۔ وقت کی پکار کو سنو۔
وقت پکار پکار کر کہہ رہا ہے۔
کہ اب نادان مردو۔ تمہارے تڑپنے کا زمانہ آ رہا ہے۔
عورت کو جتنا دبانے کی کوشش کرو گے۔ یہ اتنا ہی ابھرے گی۔
تشدد کے گھروندے ایک ایک کر کے گرتے جا رہے ہیں۔
اور عورت کی مظلومی کے آنسو۔
تابدار موتیوں کی شکل اختیار کرتے جا رہے ہیں۔
انقلاب کے جھوٹے بڑے دھارے۔
تمہارے فریب کے تمام چکروں کو پرکاہ کی طرح بہالے جائیں گے۔
اور مساوات کا وہ پرچم۔ جسے عورت ہاتھوں میں لے کر میدان میں نکلی ہے۔
دنیا کے طول وعرض میں لہراتا نظر آئے گا۔

جاگ۔ اے حوا کی بیٹی جاگ۔
ان سنہری اور روپہلی بیڑیوں کو توڑ دے۔
جو ابن آدم نے فریب سے ترے پاؤں میں ڈال رکھی ہیں۔
اس گھونگھٹ کو الٹ دے۔ جو ریاکاری کا پردہ ہے۔
یہ چاندی اور سونے کے زیور۔ جو صدیوں سے بچھوؤں کی طرح تجھے ڈس رہے ہیں اتار پھینک۔
چاند بی بی کی طرح ہاتھ میں تلوار لے کر اپنے حقوق کی حفاظت کر۔
جھانسی کی رانی کی طرح اپنی بہادری کے جوہر دکھا۔
اور رضیہ کی طرح حکمرانی اور جہانبانی کی تاریخ میں ایک درخشندہ و تابندہ بن کر نسل آدم و حوا کے لئے مشعل راہ بن جا۔
اے مادر گیتی۔ کی رونق۔
اے رستم و سہراب کی ماں۔ اے ارجن اور بھیم کو جنم دینے والی دیوی۔
اٹھ۔ رسم و رواج کے اس قید خانے کو توڑ دے۔
ان بندھنوں کو کاٹ دے۔
جن میں ابن آدم نے تجھے جکڑ رکھا ہے۔
وقت ترے ساتھ ہے۔ اور حالات ترے موافق۔
مرد کی اکڑی ہوئی گردن میں خم آتا جا رہا ہے۔

ترے صبر کے ہتھوڑے نے اس کی اکڑی ہوئی فولادی گردن کو جھکا دیا ہے۔
ترے خوبصورت ہاتھوں نے آج تک دنیا کو شراب سرمدی کے جام پلائے ہیں۔
اور ترے نغموں نے مسرت و انبساط کی مسحور کن موسیقی سے دنیا کو سرور بخشا ہے۔
اٹھ۔ اب ان ہی ہاتھوں میں انقلاب کی مشعل لے کر اٹھ۔
بندھنوں کو آگ لگا دے۔
اور رسم و رواج کے قید خانہ کو جلا کر راکھ کر دے۔
دیکھ وقت کی دیوی اپنے ہاتھوں میں تری فتح و نصرت کی خوشی میں پھولوں کا ہار لئے کھڑی ہے۔
تا کہ تری نازک کلائیوں کا بوسہ لے کر۔ کامیابی کا ہاتھ ترے گلے میں ڈال دے۔

باغی

میں وہ ہوں۔ جو کبھی سرنگوں نہیں ہوا۔
میرے عزم کے ہتھوڑے نے ہمالیہ کو ریزہ ریزہ کر دیا۔
یہ فلک بوس پہاڑ میری ٹھوکروں میں ہیں۔
چاند۔ سورج۔ اور ستارے۔
یہ وسیع نیلگوں آسمان۔
یہ جنت اور دوزخ
یہ عرش و فرش۔
سب میرے عزم کے زیر نگیں ہیں۔
میں ہواؤں پر حکومت کرتا ہوں۔
اور فضاؤں کے سینہ پر تیرتا ہوں۔
میں انسان ہوں۔ ایک ایسا انسان۔ جس کے رگ و ریشہ میں بغاوت

کی بجلیاں کوند رہی ہیں۔

میں باغی ہوں ۔ سرکش ۔ آتش نوا ۔ اور سنگدل ۔ باغی ۔

جو ۔ قانون کی پابندیوں کو توڑ کر مسکراتا ہے۔

میں باغی ہوں۔

جس کے جلو میں طوفان ۔ آندھیاں ۔ سیلاب ۔ اور قتل و خون ریزی کے

دیوتا سر جھکا کر چلتے ہیں۔

میں جب حرکت کرتا ہوں۔

دریا تھم جاتے ہیں۔

طوفان رُک جاتے ہیں۔

آندھیاں دم بخود ہو جاتی ہیں۔

سیلاب ۔ منہ موڑ لیتے ہیں۔

میں بربادی کا علمبردار ہوں۔

میں تباہی کا پیامبر ہوں۔

میرے ایک ادنےٰ اشارے پر

شاہوں کے تاج زمین پر ٹھوکریں کھانے لگتے ہیں۔

اور تخت لرزتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

میں مادرِ گیتی کی سرکش اولاد ہوں۔

جو
یزداں پر کمند ڈالنے سے نہیں چوکتا۔
میں باغی ہوں۔
میں بادِ سموم کا وہ تیز جھونکا ہوں۔
جو پھولوں کے چہروں کو جھلسا دیتا ہے۔۔ اور
کاروانوں کو پیغام موت سناتا ہے۔
میں لُو کا وہ تھپیڑا ہوں۔ کہ جس سے ابن آدم پناہ مانگتا ہے۔
میں وہ طوفان ہوں۔
جو شاہوں کے محلوں کے مرمریں منڈیروں۔ اور فقیروں کے خس پوش جھونپڑوں
میں کوئی امتیاز نہیں کرتا۔
میں وہ وحشی ہوں۔ جو خوں کے سمندر اور لاشوں کے انبار میں کھڑے ہو کر
رقص کرتا ہے۔
میں سماج۔ کے جھوٹے اور خود ساختہ بندھنوں کا قائل نہیں۔
میں وہ گیت ہوں۔
جو میدان کارزار میں گایا جاتا ہے۔
جس کی موسیقی۔ زخمیوں کے کراہنے کی آوازوں۔ مجاہدوں کے نعروں۔۔ اور
جاں بلب مجروحین کی سسکیوں سے ترتیب دی جاتی ہے۔

میں کبھی - کوثر و سلسبیل ہوں - کبھی جاں لیوا سراب صحرا -
میں موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکراتا ہوں -
اور عزرائیل کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر جوہر مردانگی دکھاتا ہوں -
میں باغی ہوں -
جو ہمیشہ سر بلند رہتا ہے -
جس کا سر کبھی نگوں نہیں ہوتا -
حکومتیں - میرے نام سے کانپتی
اور
حکمران میرے تصور سے لرزتے ہیں -
غارت گری - میرا پیشہ ہے -
اور خون ریزی میرا شعار -
میں - وہ رند خرابات ہوں جس کا پیمانۂ حیات ہمیشہ چھلکتا رہتا ہے -
میں خوشی میں ہوں
تو کرشن کی بانسری کی میٹھی لے -
میری ابرو پر شکن پڑ جائے
تو میں مہا بھارت کا یدھ ہوں -
میں صبح ازل کا ستارہ ہوں -

جس سے یہ دنیا منور ہوئی۔
میں کبھی آدم کے لباس میں تخلیق عالم کا موجب۔
اور کبھی طوفان نوح کی شکل میں تخریب جہاں کا سبب
میں کبھی دوشیزۂ بہار کی حیات افروز مسکراہٹ

اور
کبھی باد سموم کا تیز جھونکا ہوں۔
جو برگ و بار کو جلا کر چمنستان کی خوبصورتی اور رعنائی کو روند ڈالتا ہے۔
میں خودی کا پیغمبر ہوں۔
جو اپنی خودی کے ماسوا کسی غیر کے سامنے سرنگوں ہونا جانتا ہی نہیں۔
میں صور اسرافیل ہوں۔
میں کبھی ید بیضا ہوں۔ اور کبھی عصائے موسیٰ ہوں۔ جس نے نیل کے قلب کو
دو پارا کر دیا تھا۔
میں اس بوسیدہ اور بوڑھی سماج کا دشمن ہوں۔
میری شمشیر کی نوک سے حکومتیں بنتی اور بگڑتی ہیں۔
میرے خون کی سرخ روشنائی سے تاریخ عالم مرتب کی جاتی ہے۔
میں کبھی آب حیات کا جام ہوں اور ——
کبھی وہ پیالۂ زہر۔ جو سقراط کے لئے پیام موت ثابت ہوا۔

میں کبھی ندی کی مدھر موجوں ۔۔ کی خنک اور شیریں موسیقی ہوں ۔
اور ۔ کبھی سمندر کا جوار بھاٹا ۔ جس میں جہاز لرزتے ہیں ۔
میں کبھی کسی الھڑ دوشیزہ کا اوّلین بوسہ ہوں ۔ جو محبت کا داعی ہوتا ہے ۔
اور کبھی کسی فرقت زدہ کی آہِ نیم شبی ۔

میں اُس مسافر کا غم ہوں ۔ جو ابتدائے آفرینش سے صبح قیامت تک منزل کی آرزو میں مارا مارا پھرتا رہے گا ۔

میں اُس شکستہ دل حسینہ کے دل کی دھڑکن ہوں ۔ جس کا جوہر عصمت لوٹ لینے کے بعد اُسے ٹھکرا دیا گیا ۔

میں وہ کپکپاہٹ ہوں ۔ جو دو جسموں کے اولین اختلاط سے پیدا ہوتی ہے ۔

میں وہ حسین نگاہ ہوں ۔ جو پسِ چلمن جھانکنے کے بعد بھی اپنی پاکیزگی کی داعی ہوتی ہے ۔

میں اُس الھڑ کسان دوشیزہ کے دل کی غیر محسوس آواز ہوں ۔ جو بھرپور جوانی اور گداز جسم کے باوجود ۔۔ اپنی غربت کی وجہ سے ۔ اپنے سفرِ حیات کے سنگی سے محروم رہتی ہے ۔

میں باغی ہوں ۔ جس کے خمیر میں بغاوت ملی ہوئی ہے ۔
میں سرکش ہوں ۔۔ اور ہمیشہ سربلند رہوں گا ۔

میں صدائے رحیل ہوں۔ جو تاریک راتوں میں صور کی وسعتوں میں پھیل کر کارواں کی آمد کا پیام دیتی ہے۔

میں گردش ایام سے ستائے ہوئے شاعر کا ترانہ ہوں۔

میں وہ مدھر گیت ہوں۔ جو ساون کے موسم میں الھڑ دوشیزائیں مل کر آموں کے جھنڈ کے نیچے گاتی ہیں۔

میں وہ آتش فشاں پہاڑ ہوں۔ جس کے دہانے سے ہمیشہ آگ نکلتی رہتی ہے۔

میں خودی کا راگ ہوں۔

میں مجذوب کی بڑ ہوں۔

میں فرزانے کے دل کی آرزو ہوں۔

میرے دامن میں طوفان پلتے ہیں۔ بجلیاں پناہ لیتی ہیں۔ سیلاب رینگتے ہیں۔ شعلے لپکتے ہیں۔ اور چنگاریاں سلگتی ہیں۔

میں جنگ کا سربریدہ دیوتا ہوں۔

میں جہنم کی آگ سے غسل کرتا ہوں۔

میں ازل سے ہوں ابد تک رہونگا۔

میری کتاب حیات شکست کے منحوس لفظ سے خالی ہے۔

میں انسان کی فتح و کامرانی کا پھریرا ہوں۔

میں وہ پرچم ہوں۔ جو آدم کو روز اول تفویض کیا گیا تھا۔

میں غریبوں کے لئے ۔ سربلندی کا پیغام ہوں۔

اور۔

ستم رانوں کے لئے ۔ پیامِ مرگ ۔

میں امن کا دیوتا ہوں۔ ایک ایسے امن کا ۔ جو طویل خونریزی کے بعد حاصل ہوتا ہے ۔

میں وہ فولادی ہاتھ ہوں۔

جو شاہوں کے سرِ پرمغرور کو غریبوں کی خس پوش جھونپڑی کی چوکھٹ پر جھکا دیتا ہے۔

میرے دل کو اُس روز تسکین ابدی ۔ اور اطمینان ازلی حاصل ہوگا۔ جب اس نیلگوں گنبد کے نیچے ۔ بوڑھی زمین ۔ کی پیٹھ پر کسی مظلوم کی آواز نالہ نیم شبی بن کر گونجتی ہوئی سنائی نہ دے گی۔

میں وہ باغی ہوں۔

جو قسمت کے طلسم کو توڑ کر۔ حقیقت کا پرچم لہراتا ہوا۔ ہر طرف بڑھ رہا ہے ۔

میں شہنشوں کے لئے سامان عبرت ۔

اور جلے ہوئے انسانوں کے لئے پیام مسرت و شادمانی ہوں۔

میں باغی ہوں۔

ازلی اور ابدی سرکش۔

بہار آگئی

پیارے ندیم۔
بہار آگئی۔ بہار
خزاں کی ہلاکت خیزیوں کا صبر آزما دور ختم ہو گیا۔
پت جھڑ کا موسم گزر گیا۔
بہار آگئی بہار
شاخوں نے نئی پوشاک زیب تن کر لی
اور پودے رنگا رنگ پھولوں سے لد گئے۔
نیلے۔ پیلے۔ لال۔ گلابی۔ پھول۔
ہر سو۔ نظر آنے لگے۔
تاریکیاں دور ہو گئیں۔
اور
تجلیاں ضو فشاں ہیں۔

صبح بہاراں۔
شامِ غلامی کے خاتمہ کا پتہ دے رہی ہے۔
غلامی۔
کتنی جانگسل تھی۔
کتنی روح فرسا تھی۔
غلامی۔
دو صدیوں کی طویل غلامی۔
ظالم راجا نے — پرجا کا خوں نچوڑ لیا۔
انسانوں کے پچکے ہوئے گال — اُبھرے ہوئے رخسار۔
فاقوں — مسلسل فاقوں سے چہروں میں دھنسی ہوئی بے نور آنکھیں۔
پا برہنہ دوشیزائیں۔
نہ تن ڈھانکنے کو کپڑا۔
نہ پیٹ بھرنے کو قرص نان جویں۔
نہ پاسِ عزت۔
نہ احساسِ خودی۔
نہ دل کی بات کہنے کی اجازت۔
نہ استبداد کے خلاف احتجاج کا یارا۔

غیر ملکی سامراج میں جکڑے ہوئے مجبور انسان۔

ایسے انسان۔

جنھیں کبھی مذہب کے نام پر لوٹا گیا۔

اور کبھی قانون کے نام پر پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔

مسلسل غلامی نے اِن کے ضمیر مسخ کر دیئے۔

ان سے خودی کا جوہر چھین لیا۔

قانون کے نام پر قانون کو ذلیل کرنے والے حاکم۔

غلاموں ——— ۳۶ کروڑ غلاموں کے رقصِ بسملانہ کو دیکھ کر مسکراتے رہے۔

یہ رفیع الشان سرکاری عمارات۔

یہ حاکموں کے بنگلے اور کوٹھیاں۔

یہ سب ان غلاموں کی ہڈیوں کے گارے اور خون کے نقش و نگار سے مزین ہیں۔

اس برصغیر کے چپے چپے پر طالبان آزادی کا خون گرا ہے۔

یہ پھول۔ یہ بوٹے۔

سب ان ہی سرفروشان وطن کے خونِ ناحق کی آبیاری سے منصۂ شہود پر نمودار ہوئے ہیں۔

غلامی کی بھیانک اور لرزہ دینے والی یادگاروں کو یکسر مٹادو۔
آزادی کی صبح نمودار ہو چکی ہے۔
اور وقت کے مستحکم ہاتھوں نے غلامی کی بساط الٹ دی ہے۔
بیواؤں کے نالے قہقہوں میں تبدیل ہو جائیں۔
اور یتیموں کے آنسو۔ مسکراہٹوں میں ڈھل جائیں۔
اٹھو۔
اے ساکنانِ ارضِ پاک۔ اٹھو۔
آزادی کے گیت گاؤ۔
خوشی کے راگ الاپو۔
ناچو۔ خوب۔ ناچو۔
صبح بہاراں۔ آزادی کا پیام لائی ہے۔
ظلم و استبداد کا تارٹ الٹ گیا۔
اور وقت کے تیز اور طوفانی دھارے۔
غلامی کی بھیانک یادگاروں کو۔
خس و خاشاک کی طرح بہالے گئے
آزادی کے ترانے گاؤ۔
اے ساکنانِ خطۂ پاک۔ آزادی کے ترانے گاؤ۔

لیکن — آزادی — کی خوشی میں — یہ کیا ہونے لگا۔
ہر طرف آگ کے شعلے بلند ہو رہے ہیں۔
بستیاں کھنڈروں میں تبدیل ہو رہی ہیں۔
آبادیاں ویران — اور شہر اجاڑ ہوتے جا رہے ہیں۔
انسانی ہڈیوں کے ڈھانچے ہر طرف بکھرے ہوئے ہیں۔
وحشت و بربریت برہنہ ہو کر ناچ رہی ہیں۔
عورتوں کی عصمت پر حملے ہو رہے ہیں۔
دلہنوں کے سہاگ لوٹ لئے گئے ہیں۔
ماؤں کی گودیں خالی کی جا رہی ہیں۔
اور خون —
پدما — اور گومتی — کی شریر موجوں کی طرح بہہ رہا ہے۔
غلامی — کا دیو خونخوار — جس نے دو صدیوں تک اس برصغیر کے انسانوں کا خون نچوڑا — اور چوسا — جاتے ہوئے یہ کیا جادو پھونک گیا — وحشت و بربریت — اور انسان سوزی کا جادو۔
کہ
پورے برصغیر میں انسان — نے وحشی درندوں — کا لبادہ اوڑھ لیا ہے۔
یہ مذہب کے اجارہ دار —

یہ اندھے بیارت دان۔

یہ گم کردہ راہ رہنما۔

یہ بھٹکے ہوئے راہی۔

خونی۔ بن گئے۔

ڈکیت۔ اور لٹیرے بن گئے۔

اپنی ہی بستیوں کو برباد۔

اپنے ہی گھروں کو ویران۔

اپنے ہی بھائیوں کو قتل کرنے لگے۔

اپنی ماؤں۔ بہنوں۔ اور بیٹیوں کی عزت پر ہاتھ صاف کرنے لگے۔

اپنے بیٹوں کے خون سے تشنگی بجھانے لگے۔

کتنے وحشی ہیں یہ انسان۔

جنھیں۔ آزادی کی خوشی میں۔ بربادی کا ماحول پیدا کرنے میں تسکین محسوس ہو رہی ہے۔

شاعر نے۔ چوتھائی صدی تک آزادی کے ترانے گائے۔ اور غلامی کے خلاف جہاد کیا۔

لیکن۔ جب آزادی کی صبح نمودار ہوئی۔

شاعر نے اپنا سرکش سر۔ خدائے قدوس کے آستانہ جلال پر سجدہ شکر بجا لانے کے لئے رکھ دیا۔

خوشی ۔ اور مسرت ۔ کے بجر بیکراں ۔ میں اُس کی کشتیٔ حیات فتح و نصرت کے پھریرے اڑاتی ہوئی ساحل کی طرف بڑھی ۔

لیکن ۔

اُس کا دل ۔ یہ بھیانک منظر دیکھ کر خوں ہو گیا ۔

کہ ۔

ساحل پر انسانوں کی ہڈیوں کے ڈھانچے بکھرے ہوئے تھے عفت مآب دوشیزاؤں کے آئینہ عصمت کے ٹکڑے ہر سو پڑے ہوئے تھے ۔ بیواؤں کی آہوں کا دھواں پھیلا ہوا تھا ۔ اور یتیموں ۔ اور بے سہارا بوڑھوں کے سسکنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھی ۔

صبح آزادی ۔ کے ترانے ناپید تھے ۔

آزادی کا آفتاب چمک رہا تھا ۔

لیکن ۔

اس کے گرد ۔ انسانی خوں کے دھارے ایک خونی حالہ بنائے ہوئے تھے ۔

شاعر ۔ اس وقت انگیز منظر پر تڑپ گیا ۔

لیکن ۔ ہاتف غیب نے ۔ ندا دی ۔

آزادی ۔ کی ۔ یہ کم از کم قیمت ہے ۔

جو کوئی قوم ادا کر سکتی ہے ۔۔۔۔

گھبراؤ نہیں۔ اے شاعر۔ خود دار گھبراؤ نہیں۔

تمہاری زندگی کا مشن کامیاب رہا۔

اندر غلامی کا دل چیر کر آزادی کا آفتاب طلوع ہو چکا ہے۔ جس کی ضوفشانیوں

سے یہ برصغیر۔ اب ہمیشہ منور رہے گا۔

ایک عوامی گیت

قاضی نذر الاسلام

مترجمہ: قتیل شفائی

سکھیو ری!

کیوں بنسی کوئی بجاتا ہے

معصوم دلوں میں رہ رہ کر طوفان یہ کون اٹھاتا ہے

کیوں بنسی کوئی بجاتا ہے

اب تان اگر کوئی گونجے گی میں موت کا راگ سناؤنگی

بنسی نہ اگر خاموش ہوئی میں تڑپ تڑپ مر جاؤں گی

بیتے دن یاد دلاتا ہے

کیوں بنسی کوئی بجاتا ہے

برگد کے گھنیرے سائے میں جب گونجے گی آواز کوئی

میں جان پہ کھیل تو جاؤں گی، پر کھل جائے گا راز کوئی

بدنامی سے دل گھبراتا ہے
کیوں بنسی کوئی بجاتا ہے
اس دل میں محبت کا شعلہ سو جتن کیئے تب سرد ہوا
پر بنسی کی اِن تانوں سے پھر روشن دل کا درد ہوا
کیوں راگ سے آگ لگاتا ہے
کیوں بنسی کوئی بجاتا ہے!

تحریر نمودہ سیف اللہ خوشنویس
۲۱ مئی ۵۹ء